

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222848

UNIVERSAL
LIBRARY

رجسٹرڈ نمبر ۱۳۱
مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب مرحوم مغفور

کی یادگار

رسالہ

دلگداز

جلد ۲۷

بابت ماہ جنوری و فروری ۱۹۲۷ء

۲۷

مرتبہ

محمد صدیق حسن ایڈیٹر

بہت تمام

حکیم محمد سراج الحق پرنٹر و پبلشر

دلگداز پریس کٹرہ بزنس گ ۱۱۰ کا

مین جیب کر شا

کارخانہ روض الراحین لکھنؤ کا علی عطر

آپ ایک دفعہ آزمائے تو دیکھیں عطر کے لیے لکھنؤ مشہور ہے۔ مگر افسوس ہے کہ جو عطر ہے وہ باہر والوں کو نہیں ملتا کیونکہ کین ال کی روانگی نوکرون کے ہاتھ ہے اور ان کے دخل و فصل کا خیال وہ ان ہی غریبوں کو اٹھانا پڑتا ہے جو باہر سے منگوائے اور بے دیکھے خریدنے پر مجبور ہیں اور بعض اشتہار دینے والوں کی یہ حالت ہے کہ روپیہ کا مال دو کو اور کبھی چار کو بھیجتے ہیں۔ یہ عام خدایان دیکھ کے ہم نے ذمہ لیا ہے کہ باہر کے جو صاحب طلب فرامین ان کے لیے معتبر اور مستند کارخانوں کے عطر اعلیٰ درجے کے تیل وغیرہ خاص طور پر ہاتھ کر کے مال بخوبی جانچ کے اور کیفایت خرید کر کے روانہ کر دیا کہ جن کا بہت اچھا اور قابل اطمینان انتظام کیا گیا ہے عطر کے شائق ایک بار امتحان منگوا کر دیکھ لیں کہ ہمارے ذریعے سے دشمن کیسا اچھا عطر اور کن داموں کو ملتا ہے۔

عطرون کی فہرست حسب ذیل ہے

عطر خانی فیتولہ ص ۱۰۰	عطر پانی فیتولہ ص ۱۰۰	عطر عروس فیتولہ ص ۱۰۰
عطر تیار ص ۱۰۰	عطر پانی ص ۱۰۰	عطر عروس ص ۱۰۰
عطر جمیلی ص ۱۰۰	عطر جموں ص ۱۰۰	عطر جموں ص ۱۰۰
عطر کونوا ص ۱۰۰	عطر جوی ص ۱۰۰	عطر کونوا ص ۱۰۰
عطر رخ ص ۱۰۰	عطر سنترہ ص ۱۰۰	عطر رخ ص ۱۰۰
عطر غنہ ص ۱۰۰	عطر جمیا ص ۱۰۰	عطر غنہ ص ۱۰۰
عطر مولی ص ۱۰۰	عطر سیوٹی ص ۱۰۰	عطر مولی ص ۱۰۰
عطر اگر غنی ص ۱۰۰	عطر اگر غنی ص ۱۰۰	عطر اگر غنی ص ۱۰۰
عطر روح حسن ص ۱۰۰	عطر روح الکیر ص ۱۰۰	عطر روح حسن ص ۱۰۰
عطر مخلوط آصفی ص ۱۰۰	عطر مخلوط عبزی ص ۱۰۰	عطر مخلوط آصفی ص ۱۰۰

خوشبودار تیلوں کی فہرست ملاحظہ ہو

عطر حلیہ ص ۱۰۰	عطر حلیہ ص ۱۰۰	عطر حلیہ ص ۱۰۰
عطر حلیہ ص ۱۰۰	عطر حلیہ ص ۱۰۰	عطر حلیہ ص ۱۰۰

خوشبودار عطرہ بامزہ تنباکو

لی فیتولہ ص ۱۰۰	لی فیتولہ ص ۱۰۰	لی فیتولہ ص ۱۰۰
لی فیتولہ ص ۱۰۰	لی فیتولہ ص ۱۰۰	لی فیتولہ ص ۱۰۰

ردانہ ہوگا۔ بڑا اور مصافقہ ڈاک ذمہ خریدار۔
 اکتی میجر دکنہ از کمرہ بن سجان لکھنؤ

Checked 1968



دوستو! ۱۹۷۷ء عیسوی رخصت ہوا اور ۱۹۷۷ء عیسوی آگیا۔ یا یوں
 کہیے کہ زمانہ کی کتاب کا ایک ورق اور اسٹ گیا اور ہمیں خبر بھی نہ ہونے پائی
 اور ہوتی بھی تو کیا کر سکتے کیونکہ یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ اسے نہ اُٹنے دیں
 اب دوسرا ورق جو ہمارے پیش نظر ہے وہ ۱۹۷۷ء عیسوی ہے جنٹرولن میں
 طرح طرح کی پیشین گوئیاں لکھی ہوئی ہیں کہ اس ملک میں یہ ہوگا۔ اور فلان ملک
 میں یہ۔ مگر قطعی طور پر کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہاں ہمارے اور ساری دنیا کے
 ساتھ کیسا برتاؤ کرے گا۔

ہر شخص کو سب سے پہلے خود اپنی اور اپنی قوم کی فکر ہوتی ہے۔ لہذا ہم
 بھی سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء نے ہمارے ساتھ کیسا سلوک کیا حضرات
 اگر آپ برلن یا مین تو ہم بھی کہیں گے کہ ۱۹۷۷ء ہمارے اور ہمارے دگلدار کے لیے
 بدترین سال رہا۔ اس نے ہمیں ایسا سخت اور جگر خراش صدمہ پہنچا یا ہے جو ساری
 عمر نہ بھولے گا۔ اور ہمارا دگلدار بھی اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ والد صاحب قبلہ مولانا
 عبدالحلیم صاحب مرحوم کی وفات ایک ایسا قومی نقصان ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول
 سکتے۔ آپ ادبی دنیا میں ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ یاد کیے جائیں گے۔ اور جس
 زمانہ گزرا۔ ا جائے گا اُسی قدر آپ کی عزت بڑھتی رہے گی۔ مرحوم عجیب صفات کے
 بزرگ تھے۔ آپ نے مسلسل چالیس سال سے زیادہ ملک کی ادبی خدمات کی۔ اور آخر

وقت تک اُسی میں مصروف رہے۔ آٹھ دس میلے قبل آپ کو ایک دماغی شکایت پیدا ہوئی اور ڈاکٹر دن اور طبیبوں نے متفقہ طور پر یہ راس دی کہ اب دماغی کام چھوڑ دیں۔ آپ کے وہ الفاظ میں کبھی نہ بھولوں گا جو آپ نے اس وقت میں مجھے تحریر فرمائے کہ ”حکیم اور ڈاکٹر یہ تجویز کرتے ہیں کہ اب میں دماغی کام چھوڑ دوں۔ مگر تم ہی بتاؤ کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ دوں تو پھر کیا کروں۔ میرے لیے اس کے چھوڑ دینے سے مرعہ ابد رہ جائے یا وہ آسان ہے“ یہ ادبی خدمت آپ کی ذات کے ساتھ لازم و ملزوم ہو گئی تھی۔ مگر افسوس! آن قدر بے شکست و آن ساقی نہ ملنا مرحوم کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ یہ دگلڈاز ہے جس نے اپنے گزشتہ چالیس سال کے دور میں اتنا بڑا اور ایسا بہترین لٹریچر پیدا کر دیا جس پر زبان اردو ہمیشہ از کرنی رہے گی۔ دگلڈاز کی پیروی میں ملک میں بہت سے رسالے نکلے اور پھیلے پھولے۔ اور اب بھی نہایت آب و تاب کے ساتھ نکل رہے ہیں۔ مگر یہ دگلڈاز ہی کی برکت ہے جس نے ملک کو اس طرف متوجہ کیا۔ اور اب تو یہ دیکھ کے ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے کہ کوئی مہینہ نہیں جاتا جس میں اردو کے تین چار نئے رسالے اس ملک میں نکلنے نہ شروع ہوتے ہوں۔ مگر کاش ان میں استقلال بھی ہوتا۔

اس کے سوا مولانا محمد کی بیشمار تالیفات بھی اردو لٹریچر میں بڑا پایہ رکھتی ہیں۔ ناول نویسی کا فن اردو میں آپ ہی کی ذات سے شروع ہوا اور آپ ہی نے اُسے پائیدار بنایا۔ تاریخ کو جس آسان اور دلچسپ طریقے پر آپ نے زبان اردو میں رواج دیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچہ بچہ میں تاریخی ذوق و شوق پیدا ہو گیا۔ فردوس بریں میں علی و جودی اور فلور فلور بڑائیں ”بولاجیس“ کے کیرکٹر ایسی زندہ اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں جو ہمیں کبھی نہیں بھول سکتیں اور جب تک زبان اردو رائج ہے کبھی نہ مٹ سکیں گی۔

غرض سلسلہ ہمارے لیے ایک ایسا منحوس سال گذرا۔ اور اس نے ہمیں ایسا سخت نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۲۷ء سے پہلے اکثر ایسا ہوتا رہا کہ دگلڈاز دیر سے شائع ہوا اور دودو مین مینوں کے

رسالے ایک ساتھ شائع کر دیے گئے۔ مگر اس سال دگلڈاز برابر وقت معینہ پر پڑی پابندی کے ساتھ نکلتا رہا۔

ہم نے تو اپنی ساری اپ بھرت آپ بتائیے کہ آپ کے ساتھ ۱۹۲۶ء کا سال کسارا اور آپ نے گزشتہ سال بھرمین کیا کیا بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو خوش ہوئے یہ بتا سکیں کہ ہم نے یہ کامیابی حاصل کی مگر زیادہ تر لوگ سرنجیا کرتے ہی جواب دین گے کہ کچھ نہیں!

اب یہ نیا سال ۱۹۲۷ء ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں چاہیے کہ وقت کی قدر کر کے کارخانہ قدرت میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس کے ایک ایک لمحے کو اسی حد تک کارآمد بنائیں جس حد تک ۱۹۲۶ء کو ہم نے بیکار ضائع کر دیا ہے۔

حسن کی کرشمہ سازیان

جوانا ملکہ نیپلز

یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ عورتوں نے بڑے بڑے حکمرانوں اور شہنشاہوں کے دلوں کو منہ کر لیا اور ان کے ذریعے سے قوموں اور سلطنتوں پر حکومت کی۔ مگر اس وقت ہم اپنے ناظرین کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے دین سیجی کے سب سے بڑے مقتدا پوپوں پر قبضہ حاصل کر کے کس طرح مذہب عیسوی پر بھی حکمرانی کی ہے۔ کئی پوپ محض عورتوں کے اثر سے اس مرتبہ تک بیوقوف ہو سکے۔ اور انھیں کے ذریعے سے سیجی دنیا پر حکومت کرتے رہے یا یہ کہا جائے کہ دراصل ان عورتوں نے حکومت کی۔ انھیں میں ایک جوانا ملکہ نیپلز بھی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کلیمنٹ ششم پوپ تھا اور قدیم مقدس شہر روما کو چھوڑ کے پوپوں نے فرانسیسی سرزمین کے شہر "اے وگن" کو اپنا مرکز پائی قرار دیا تھا۔ اگر پوپوں کی تاریخ الگ کر کے لکھی جائے تو یہ صاف نظر آجائے گا کہ جوانا ملکہ نیپلز نے اس تاریخ میں کیسا نمایاں حصہ لیا ہے۔ اصل میں اسی کی وجہ سے پاپائی اقتدار کو فرانس میں عروج حاصل ہوا۔ اور دو تین پوپوں کے زمانے میں وہی دین عیسوی پر حکومت کرتی رہی۔

اُس زمانے کے مورخین کا بیان ہے کہ جونا بڑی حسین ملکہ تھی اور ۱۳۷۳ء میں جبکہ اسکی عمر صرف سولہ سال کی تھی نیپلز کے تاج و تخت کی مالک ہوئی۔ والدین کا اُسکی کم عمری میں انتقال ہو چکا تھا۔ اور اُسکی شادی لوئی شاہ ہنگری کے بھائی شہزادہ اندر وے کے ساتھ ہو گئی تھی۔ بد قسمتی سے یہ شوہر ملکہ کو پسند نہ آیا۔ چند ہی روز میں اُس سے نفرت ہو گئی۔ اور دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے حسد و رقابت کے جذبات پیدا ہو گئے۔

نیپلز کا یہ زمانہ بڑی بے چینی اور بد امنی کا تھا۔ ہر شخص یہ کہتا تھا کہ کوئی انقلاب ہونے والا ہے۔ مشہور مورخ پٹرارک اسی زمانہ میں نیپلز آیا۔ وہ لکھتا ہے "آہ انیپلز کی حالت کیسی افسوس ناک ہے! جس نے اس شہر کو پہلے کبھی دیکھا اگر آج آکے دیکھے تو ہرگز نہ پہچانے کہ یہ وہی خوبصورت شہر ہے۔ دیندار سی۔ سچائی۔ اور مروت کسی میں نہیں باقی رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ آباد ہیں جو ایک دوسرے کو قتل کرنے کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں رکھتے۔ ایک دلیل اور ادنیٰ درجے کا پادری حکومت کر رہا ہے۔ وہ بظاہر ایک امیلا جو غم پہنے تنگے سر اور تنگے پیر بھر کرتا ہے مگر اصل میں اُس نے جو رد و ستم سے بیشمار دولت پیدا کر لی ہے۔ اس کے گھر میں جا کے دیکھیے وہ عیش و عشرت اور حرام کاری کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ پادری جس کا نام بارٹ ہے یہاں کا مختار کل ہے اور ظلم و تعدی میں شاید ہی کوئی اس سے بڑھا ہو۔ یہ شیطان غریبوں کو لوٹتا اور تنگ کرتا ہے۔ ایسے دن کو ستانا اور ذلیل کرنا ہے انصاف اس کے نزدیک کوئی چیز نہیں۔ جو اسکی مرضی ہو وہی انصاف ہے۔ ملکہ جونا اور شہزادہ اندر وے دونوں اس سے ڈرتے ہیں۔ سارے شہر میں ایک خوفناک خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ گھروں کے اندر بھی لوگ سرگوشیاں کرنے ڈرتے ہیں کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی اس کے خلاف نہ لگایا اور اُسے بڑی سخت سزا دی جاتی ہے۔ کوئی شخص اپنے دلی جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا"

ملکہ جونا کے دل میں اپنے شوہر کی طرف سے نفرت روز بڑھتی گئی اُسے اپنے ایک عزیز بن لوئی مارٹو سے محبت پیدا ہو گئی۔ ملکہ کا میلان اُس کی طرف دیکھ کے مارٹو کے دوستوں نے یہ ارادہ کیا کہ شہزادہ اندر وے اور

پادری رابرٹ دونون کا خاتمہ کر دین تاکہ ملکہ اور اس کا دوست ٹامز ٹوٹا زادی سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس زمانے کے شاہی درباروں میں اس طرح کا قتل کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ان میں یہ امر طے پا چکا تھا کہ شہزادہ آندر و قتل کر دیا جائے مگر اس پر فورہ ہو رہا تھا کہ کس طریقے سے اس کا خاتمہ ہو۔

نپلز کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ ایک شام کو سب درباری موجود تھے۔ ملکہ ایک جگہ بیٹھی چاندی سونے کے تاروں کا ایک تسمہ بن رہی تھی اس کا شوہر کمرے میں ٹل رہا تھا۔ ایک دفعہ قریب سے گزرا تو اس نے پوچھا آپ یہ کیا بنا رہی ہیں۔ جو انا ایک لمحہ بھر خاموش رہی۔ پھر اس نے نظر اٹھا کے معنی خیز قسم کے ساتھ آندر و کی صورت دیکھی۔ اور جواب دیا، "جناب یہ تسمہ ہے اور آپ کا گلا گھوٹنے کے لیے بنا جاتا ہے"

گرمیوں کے زمانے میں بادشاہ اور اہل دربار نپلز سے باہر دیات کی کھلی ہوا کا لطف اٹھانے چلے جایا کرتے تھے۔ ۱۸۳۷ء کے موسم گرما میں بھی ملکہ جو انا شہزادہ آندر و اور دباری امراسقام "اے ورسا" میں آگئے تھے۔ یہ ایک نہایت ہی خوشگوار علاقہ تھا۔ ایک رات کو سب اپنے اپنے بستروں پر سو چکے تھے۔ آدھی رات گزر گئی۔ تب ملکہ کی ایک خادمہ اس شاہی آرام گاہ میں آئی۔ اور شاہزادہ آندر و کو جگا کے یہ خبر دی کہ پادری رابرٹ کے پاس سے ایک قاصد آیا ہے اور کسی اہم مسئلہ میں آپ سے فوری گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ شہزادہ جسے کسی سازش یا دغا بازی کا دہم و گمان بھی نہ تھا فوراً اٹھ بیٹھا اور چلا کہ اُس قاصد سے ملے۔ مگر وہ اس کمرے سے نکل کے دوسرے کمرے میں آیا تھا کہ سب طرف کے دروازے بند کر لیے گئے۔ اور چند لوگوں نے شہزادہ کو پکڑ کے اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ مونسہ میں کپڑا بھونسن دیا پھر اسے گھسیٹ کے برآمدہ پر لے آئے۔ اور گلے میں پھانسی ڈال کے نیچے لٹکا دیا۔ ان سازش کرنے والے قاتلوں میں سے بعض فوراً ہی اتر گئے اور اُس کے سر پکڑ کے زور سے پھینچ لیے تاکہ اس کا کام جلد تمام ہو جائے۔ شہزادہ آندر و کی کھلائی جو برآمدہ کے نیچے سو رہی تھی شور و غل کی آواز سن کے

جاگ پڑی یہ دیکھ کے اُس نے غل جھپایا۔ مگر اس اثنا میں قاتل اپنا کام کر چکے تھے اور بھاگ گئے۔ اس کھلائی کا بیان تھا کہ جو انا بھی اس قتل میں شریک تھی اس ملکہ میں شہوت پرستی کے جذبات اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ اس کے درباریوں میں شاید ہی کوئی ایسا بے نصیب ہو جس نے جو انا کے حسن و جمال کے مزے نہ لوئے ہوں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہزادہ انڈرو کے قتل میں اگر وہ خود شریک نہیں تو کم از کم اس سازش سے ضرور واقف تھی۔ بعض لوگوں کا بیان تھا کہ خود ملکہ کے حکم سے یہ جرم سرزد ہوا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کہاں تک صحیح ہے لیکن اگر جو انا اپنے شوہر کے قتل کی ذمہ دار یا کم از کم اس سازش سے واقف تھی تو تاریخ میں صرف ایک اسی ملکہ کا نام ایسا نہ ملے گا جس نے اپنے حسن پرست دوستوں کی مدد سے ایک سیدھے ساوے شوہر کا خاتمہ کر دیا ہو۔ جرائم کی تاریخ میں یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں کہ عورت نے اپنے بے شمار عاشقوں کو خوش کرنے کے لیے شوہر کو قتل کر دیا ہو لہذا جو انا کا اس قتل میں شریک ہونا خلاف قیاس یا غیر ممکن نہیں کہا جاسکتا۔

بعض لوگ یہاں تک کہتے تھے کہ جو انا کے دوستوں نے شہزادہ انڈرو کے ہاتھ پانوں باندھ کے بے دست و پا کر دیا۔ اور ملکہ نے خود اپنے ہاتھ سے شہزادہ کے گلے میں اُسی تسمہ سے پھانسی لگائی جو خود اس نے بن کے تیار کیا تھا۔

غرض دوسرے دن صبح کو شہر نیلپز میں یہ مشہور ہوا کہ بعض نامعلوم قاتلوں نے شہزادہ انڈرو کا کام تمام کر دیا۔ مگر کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس افسوس ناگ واقعہ کے تفصیلی حالات کا پتہ لگاتا۔

یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ جو انا ایک ایسی سازش سے بے خبر رہی ہو جو خود اُس کے کمرے کے دروازے پر عمل میں لائی جائے۔ اور جس میں اس کے عاشق مزاج دوست بھی شریک ہوں۔ کیا یہ قرین قیاس ہے کہ انہیں بغیر ملکہ کی مرضی کے اتنے بڑے کام کی جرأت ہو سکتی تھی؟ اب یہ خبر سارے ملک میں مشہور ہوئی۔ پوپ کلیمنٹ ششم

نے اس قتل کا الزام جو ان پر صاف الفاظ میں تو نہیں لگایا، مگر ان شبہ ضرور کیا اور یہ شبہات بعد کے واقعات سے زیادہ قوی ہو گئے۔ کیونکہ ملکہ نے اپنے شوہر کے مار ڈالے جانے پر کسی قسم کا سوگ نہیں منایا اور جن لوگوں پر قتل کا شبہ کیا جاتا تھا ان کی طرف داری کرنے لگی۔ ہر شخص بخوبی جانتا اور سمجھتا تھا کہ شہزادہ انڈرو کے قتل کی ذمہ دار خود ملکہ جو انا ہے۔

قاصدوں کے ذریعہ جو انا نے شاہ ہنگری اور پوپ کلینٹ ششم کو اس افسوس ناک واقعہ کی اطلاع دی اور مقتول شہزادے کے بھائی کوئی شاہ ہنگری کو ملکہ نے یہ بھی لکھا کہ اب آپ ہی میرے محافظ و معاون ہیں۔

پوپ نے یہ خبر سنتے ہی ایک کارڈنل فلیپ کو نیپلز بھیجا۔ اُسے حکم دیا کہ وہ ان جا کے اس کی تحقیقات کرو۔ اور قاتلوں کو پوری سزا دے مگر ساتھ ہی یہ بھی چیک سے سمجھا دیا کہ اگر الزام خود ملکہ جو انا پر ثابت ہوتا ہو تو شہادت کو مخفی رکھا جائے۔ اس کارڈنل نے فیلیپین آ کے تحقیقات شروع کی مگر وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچے پایا تھا کہ شاہ ہنگری نے انتقام کی آواز بلند کی۔ اور پوپ سے مطالبہ کیا کہ مجرم ملکہ کو سزا دی جائے۔ پوپ نے شہزادہ انڈرو کے قاتلوں کو (بغیر کسی کا نام لیے) بددعا میں دین اور انھیں دینی حقوق سے محروم کر دیا۔ مگر کوئی کے انتقام کی آگ اور اس سے زیادہ اس کے الو العرجی کے جذبات کو ان باتوں سے تسکین نہ ہوئی۔ پہلے سے اُس کی دلی آرزو تھی کہ کسی طرح خوبصورت شہر نیپلز اور اس کے سرسبز و شاداب علاقے کو اپنے ملک میں شامل کرے۔ اب ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اور خاص نیپلز میں اُس کے بہت سے طرفدار بھی موجود تھے۔

اس اثنا میں جو انا کو یہ نظر آیا کہ اب میں بے یار و مددگار ہوں سب لوگ بطن ہو کے ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں اور سلطنت کی حالت روز بروز زیادہ خراب ہوتی جاتی ہے۔ لہذا کسی مرد کے قوی بازو کو اپنا معاون بنا کر ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار کر کے اس نے اپنے عاشق دوست کوئی مارٹو سے عقد کر لیا جو اس کا عزیز بھی تھا۔ اصل یہ ہے کہ انڈرو کے قتل ہونے سے پہلے ہی وہ اس کے ساتھ عقد کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اب نیپلز کے زیادہ تر لوگ جو انا کو

خلاف ہو گئے۔ اور اُسے مدد کی ضرورت تھی مگر کوئی مارٹو باوجود اپنی مائالی و شجاعت کے ملکہ کو آنے والے طوفان سے نہ بچا سکا۔

لوئی شاہ ہنگری ایک بہت بڑی فوج مرتب کر کے جرمنی کے درمیانی علاقے سے نکلا۔ اُس نے ایک جھنڈا بلند کیا جس پر مقتول شہزادہ اندرو کی تصویر بنی تھی۔ اُس نے جونا کے ملک پر حملہ کیا اور بغیر کسی مزاحمت کے نیپلز کے پچھاٹک تک آ پہنچا۔ جونا نے یہ مصیبت دیکھی تو ارادہ کر لیا کہ اسے وگنن میں جا کے اپنے محلے کو لوپ کے سامنے خود پیش کرے۔ یہ بھی عام طور پر مشہور تھا کہ موجودہ لوپ صاحب خوبصورت عورتوں کے بہت دلدادہ ہیں اور اُن کے ساتھ خصوصیت سے پیش آتے ہیں۔ جونا کو اپنے حن و جمال پر ناز اور دعویٰ تھا کہ ممکن نہیں کوئی میری صورت دیکھے اور فریفتہ نہ ہو جائے۔ خود دہان جانے سے ایسا یہ فائدہ بھی نظر آیا کہ اپنی دلکش و دل فریب آواز سے لوپ اور اُن کے مشیرین کو اپنی بیگناہی کا یقین دلادوں گی اور وہ ساری سچی دنیا میں میری بیگناہی کا اعلان کر دیں گے۔ ان خیالات کو دل میں لیے ہوئے جونا شہر آئے وگنن میں لوپ کے اس با عظمت دربار میں پہنچی جو شان و شوکت کے لحاظ سے یورپ کے تمام شاہی درباروں سے بڑھا ہوا تھا۔

لوپ نے ملکہ کے لیے باقاعدہ دربار منعقد کیا خود لوپ ایک سہرے تخت پر جلوہ افروز تھا۔ اس کے جسم پر برف کا سا سفید لباس تھا جو اس وقت چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ پاپائی کا تہر تاج سر پر تھا۔ اس کے گرد ایک نصف دائرہ میں کئی کارڈنل سرخ لباس پہنے بیٹھے تھے۔ امرا۔ شہزادے مختلف ملک کے حکمران اور سفیر اپنے اپنے رتبوں کے لحاظ سے جلوہ افروز تھے۔

مازنین ملکہ جونا کو جس کا چہرہ اس وقت نہر دہو رہا تھا دو کارڈنل اس شاندار دربار میں لائے۔ ملکہ کے پیچھے اس کے درباری اور امراء تھے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی وہ پاپائے مقدس کے تخت کے پاس آئی۔ وہ ان تک پہنچنے سے پہلے وہ تین دفعہ تعظیماً جھک کے آداب بجالائی۔ پھر

آگے بڑھ کے پاپاے اعظم کے جوتے پر جو صلیب کا نشان بنا تھا اُسے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ اس کے بعد اپنے رکتے کے اعزاز کے لحاظ سے اُسے پوپ کے ہاتھ کو بھی بوسہ دینے اور آنکھوں سے لگانے کی عزت نصیب ہوئی۔

پوپ کیمینٹ ششم اپنے زمانے کا بڑا ایدار مغز حکمران تھا۔ زاہد خشک ہونے کے بجائے اُس میں مروت اور سب سے زیادہ حسن و عشق کے جذبات موجزن تھے۔ حسین عورتوں پر وہ ہمیشہ مہربان رہتا۔ اور اُن سے بڑے اخلاق سے پیش آتا۔ جو انانیت حسین ملکہ تھی لہذا اس موقع پر پوپ کیمینٹ اس کے ساتھ نہایت اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا۔ اُس نے ملکہ کو جو ایک مجرم کی حیثیت سے جھکی ہوئی سامنے کھڑی تھی شفقت کے ساتھ اٹھا کے گٹے سے لگایا۔ اور چند لفظوں میں اُس کی تسلی و تشفی کر کے اپنے پاس بٹھالیا۔

جوانا کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ وہ بڑی عقلمند ملکہ تھی! اس وقت بااقتدار ججون کے سامنے جرم سے اپنی بریت ثابت کرنے کی کڑی ہوئی حسین شہزادی نے اپنی مظلومی کی داستان غم ایسے انداز سے بیان کرنی شروع کی کہ شخص آپ سے باہر ہو گیا۔ ذہین اور قابل ملکہ نے موقع کے لحاظ سے لاطینی زبان میں تقریر کی۔ اُس زمانے کے سب مورخین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ اس کی یہ تقریر فصاحت اور مہجربائی کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔ اس نے اپنی بیگناہی اپنی عزت اور اپنی سلطنت کی حمایت میں تقریر کی۔ اور جہاں تک زبان نے یاری دی اپنی سُرلی آواز اور دلفریب لہجے میں کوئی ایسی بات نہیں اٹھا رکھی جو سننے والوں کے دلوں کو انہی طرف مائل نہ کر سکے۔ وہ نوجوان حسین دلفریب اور خوش بیان تھی۔ اُس کے بیان نے جادو کر دیا۔ اُس کی تقریر کا سامعین کے دلوں پر ایسا اثر پڑا کہ سننے والے حیرت میں رہ گئے۔ جو کچھ وہ کہتی جاتی سب اس کا اعتراف کرتے جاتے تھے۔ اُس کی ادائوں نے پوپ اور کارڈنلون کے دلوں میں بلا در عایت انصاف کرنے کے بجائے حسین و دلفریب ملکہ کی طرف داری کا خیال جان گزین کر دیا۔ اس سے پہلے پوپ کو بھی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ملکہ اس شان و شوکت میں ضرور سر یک ہے اور مشہور تھا کہ اسے ملکہ سے نفرت پیدا ہو گئی

ہو۔ ملکہ کے دربار میں آنے سے پہلے چاہے کچھ ہی خیال ہو مگر جو امانے و امان
پہنچ کے پوپ اور اُس کے ساتھ کل کارڈنلون پر فتح پائی۔ اُن کا خیال بالکل بدل
گیا۔ اور اب وہ سب ملکہ کے طرفدار اور حامی تھے۔ اصل یہ ہے کہ ملکہ کو محض اپنے حق و حال
کی بدولت کامیابی حاصل ہوئی۔ اگر ملکہ اتنی حسین نہ ہوتی یا اس کا فیصلہ نہ ہوتا۔ حج مردون
کے بجائے عورتیں ہوتیں تو خدا معلوم کیا نتیجہ ہوتا۔ اور ملکہ کو اس کی پاداش میں کیسی کسی
سزائیں جھگڑتی پڑتیں۔ مگر ملکہ کا تجربہ نامیان ختم ہونے سے پہلے ہی کئی کارڈنلون اس کو دام
محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ اس کی دلکش آواز و لہریب اداؤں اور خوش بیانی نے
مخالفین کو بھی مسح کر لیا۔ اور سب نے ایک زبان ہو کر یہ راستہ دی کہ ملکہ بالکل بگینا ہ
ہے۔ اور صرف بگینا ہی نہیں بلکہ اس کے طرز عمل میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں
پوپ کلمنٹ پر بھی اس کا پورا جادو چل گیا تھا۔ اور اس نے اپنے مشیران کی رائے کی تائید
کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ جو امانا بالکل بے گناہ ہے۔

دربار پر خواست ہوا۔ جو امان فتح مندی کی شان و شوکت سے واپس چلی اس کا
چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ پوپ کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس کے جائے قیام تک پہنچا کر
جائے مگر پاپائی و قاقا کو قائم رکھنا بھی ضرور تھا۔ مجبوراً کمرے کے باہر تک پہنچا کر
رخصت کیا۔ جو امان سمجھ گئی تھی کہ پوپ پر سیراجادو چل گیا ہے لہذا اُس نے اسی وقت
نیکمر واپس جانے کی اجازت چاہی۔ پوپ نے اسے کسی طرح منظور نہ کیا۔ اور
چند روز آگے وگنن میں رہنے پر اصرار کیا۔ اسی روز شام کو پوپ نے ملکہ
کی ایک بڑی شاندار دعوت کی جس میں کل معزین دربار پاپائی اور دیگر امرا اور
شہزادے مدعو تھے جو امان دعوت میں شریک ہوئی۔ مگر وہ کھانا کھاتے ہی واپس چلی
گئی۔ وہ جلسہ اور ناچ میں شریک نہیں ہوئی۔ اس نے کہا کہ مجھ سے بد نصیب آوارہ
وطن کے لیے جس کا تاج و تخت چھن گیا ہو ناچ۔ گانے کے جلسے میں شریک ہو نا۔
مناسب نہیں۔ پوپ نے اس وقت اس سے وعدہ لے لیا کہ وہ دو چار مہینے
آگے وگنن میں رہے گی۔ اصل یہ ہے کہ جو امان کا واپسی پر اصرار ایک اندازہ عشوقا
تھا۔ وہ بخوبی سمجھ رہی تھی کہ پوپ کے قریب رہ کر اور اُس کی منظور خاطر بن کر میں
کیسے فائدے حاصل کر سکوں گی۔ وہ اپنی حالت کو جانتی تھی جو امان اس پر لگا لگا

تھا اس سے تو بیشک بری کوئی گئی تھی مگر اس کا ملک ابھی تک دشمنوں کے قبضے میں تھا۔ یہ ضرور تھا کہ نیپلز کے لوگ اتنے ہی دنوں میں ہنگری والے حملہ آوروں کے مظالم سے بے حد پریشان ہو گئے تھے اور ملکہ جوآنا کی واپسی کے آرزو مند تھے مگر اتنی قوت کس میں تھی کہ انھیں لڑ بھر کے اپنے ملک سے نکالنا۔ اگر اتنی قوت ہوتی تو ملکہ کو اپنا ملک چھوڑ کے بھاگنا ہی کیوں پڑتا۔ بہر حال کسی قدر پس و پیش کے بعد جوآنا نے پوپ کے ارشاد کو قبول کر لیا۔ اور دو تین مہینے آسے وگ نن میں رہنے پر آمادگی ظاہر کی۔ پوپ نے کہا کہ اس اثنائ میں نامہ و پیام کر کے ہنگری کے بادشاہ کو اس پر آمادہ کیا جائے گا کہ وہ ملکہ جوآنا کے علاقے سے اپنی فوجیں ہٹائے۔

مگر یہ معاملہ جس قدر آسان نظر آتا تھا اس آسانی سے طے نہ ہو سکا۔ کوئی شاہ ہنگری نے اپنے مفتوحہ علاقے کے کسی حصے کو چھوڑنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اتنے دنوں میں جوآنا نے پوپ کو اس قدر اپنے قابو میں کر لیا کہ اب وہ بالکل اسی کے ماتھ میں تھا۔ وہ بغیر جوآنا سے مشورہ لیے کوئی کام نہ کرتا۔ اور ملکہ کے بغیر اسے کسی طرح چین نہ پڑتا۔ ہر وقت ملکہ جوآنا اس کے پاس رہتی۔ خاص مقام آسے وگ نن جس میں پوپ صاحب رونق افروز تھے نیپلز کی سلطنت میں شامل تھا۔ پوپ نے اس شہر کو اتنی ہزار اشرفیوں کے معاوضے میں خرید لیا۔ اگرچہ یہ قیمت برائے نام تھی مگر ملکہ کو اسی پر راضی ہونا پڑا کیونکہ اسے ابھی پوپ سے بہت کام لینا تھا۔ پوپ نے اپنے ایک کارڈنل کو قوسی شاہ ہنگری کے پاس نیپلز میں بھیجا تاکہ اسے نیپلز سے فوجیں ہٹالینے پر آمادہ کرے۔ پوپ کی جوآنا پر اتنی مہربانی دیکھ کے کوئی کو بھی ہی مناسب معلوم ہوا کہ نیپلز چھوڑ دے۔ وہ وہاں سے چلا گیا اور جوآنا نہایت تنگ و احتشام کے ساتھ نیپلز میں آئی جس پر رعایا نے بڑی خوشیاں منائیں۔ اب ملکہ کی قدر بہت زیادہ ہو گئی۔ دربار پاپائی نے اسے تاج و تخت واپس دلایا تھا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ خود پوپ اسے اس درجہ چاہتے اور اس کی اتنی عزت کرتے تھے کہ کسی دوسرے کی وہاں تک رسائی نہ تھی۔ اس زمانے میں کوئی اتنی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ کہتا پوپ صاحب کیسی شرمناک زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس وقت سب کا یہ خیال تھا کہ اگر پوپ کے حرکات و سکنات پر

سلطنت میں شامل ہو گیا تو پوپ بھی اس کے زیر اثر ہو جائیں گے۔ اس وقت نیپلز ایک چھوٹی سی ریاست ہے اور پوپوں پر اتنا اثر نہیں ڈال سکتی جتنا فرانس کی عظیم الشان اور طاقتور سلطنت کا اثر پڑے گا۔

شاہ فرانس کو ملکہ جواں کی طرح سے بدظن کرنے کے لیے آربن نے کوئی بات نہیں اٹھا رکھی۔ جواں کی عشق بازیوں کی ساری داستانیں کہ سنائیں۔ یہ بھی بتایا کہ اپنے پہلے شوہر کو خود اسی نے قتل کرایا تھا۔ اور پھر اس الزام سے بری ثابت ہونے کے لیے اس نے پوپ کی خدمت میں بہت سی اشرقیانہ تدبیریں کر کے اپنے فریب عشق میں پھانس بیاہر بھی بیان کیا کہ نیپلز کے درباریوں میں کوئی ایسا نہیں جو جواں کی شہوت پرستیوں کی بدولت اس کے بستر عیش تک نہ پہنچ چکا ہو۔ جواں ایسی عورت نہ تھی کہ اگر دل چاہتا تو پوپ کے روکنے سے رک جاتی۔ مگر اس رشتہ کو خود اسی نے نہیں پسند کیا۔ کیونکہ وہی عہد فرانس خود اس سے دس بارہ برس چھوٹا ایک کمسن لڑکا تھا۔ دوسرے وہ سمجھتی تھی کہ فرانس اتنی بڑی اور طاقتور سلطنت ہے کہ اس میں شامل ہونے کے بری سلطنت نیپلز نیست و نابود ہو جائے گی۔ لہذا ملکہ کو یہ رشتہ مناسب نہ معلوم ہوا اور اس نے فوراً تجارت کے حکمران جیمس کے ساتھ شادی کر لی؟ اس زمانے کا سب سے

زیادہ خوبصورت بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ جیمس اس وقت بے تاج و تخت بادشاہ تھا۔ کیونکہ آراغون کے بادشاہ نے اسے ملک و کال باہر کیا تھا اور اس نے یار و مددگار بھاگ کر نیپلز میں پناہ لی تھی۔ ملکہ جواں کا دل اس کی جانب مائل ہو گیا۔ اور خود ملکہ نے شادی کا پیام دیا۔ شہزادہ نے ان سب شرطوں کو جو پیش کی گئیں بڑے شوق سے قبول کر لیا۔ اور نہایت ہی شان و شوکت کے جلسوں کے ساتھ مراسم عہد ادا ہوئے۔ پوپ آربن کو یہ شادی پسند نہ تھی مگر اپنی دوست ملکہ جواں کو ناخوش بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہذا اس نے ملکہ کو مبارکباد کا پیام بھیجا۔ پوپ آربن اب یہ چاہتا تھا کہ اسے دگن کو چھوڑ کے پھر مقدس و متبرک شہر روم میں جا کر رہے اور پہلے کی طرح اسی کو اقتدار پایائی کا صدر مقام بنائے۔ اس میں بڑی دقیقہ کشی۔ سب کارڈنل سرزمین فرانس کی عیش و عشرت کے عادی ہو چکے تھے۔ اس فرحت بخش مقام کو چھوڑ کر روم میں واپس جانا نہیں پسند کرتا تھا۔ جب آربن نے یہ خیال ظاہر کیا

سب اس کے مخالف ہو گئے۔ مگر آربن نے کسی کی پروا نہ کی یہاں تک کہ روانگی کے وقت اُنکی ماں کمرے کے دروازے میں لیٹ گئی کہیں خوشی سے نہ جانے دون گی۔ مگر پوپ نے اس کا کوئی خیال نہ کیا اور اوپر سے پھاندے نکل گیا۔

مرکز پاپائی کی تبدیلی میں فقط ایک ملکہ جو آنا آربن کی طرف لڑتھی اس وجہ سے نہیں کہ پوپ کے تہہ اجانے سے اُس کا کوئی فائدہ تھا بلکہ محض اس خیال سے کہ اس کے دوست اور عاشق آربن کی خوشی ہی تھی بغرض پوپ اسے وگنن سے روانہ ہو کے روم میں آگیا۔ سفر کا سارا انتظام ملکہ جو آنا نے اپنے افسران اور جہازوں کے ذریعہ کر دیا۔ روم میں پہنچتے ہی آربن نے خوشیاں منائیں! اور قدیم تبرک شہر میں واپس آنے پر جو اُمرا و جاگیردار مبارک بادیں آئے اُن میں ملکہ جو آنا ابھی تھی اس کا شاندار استقبال ہوا۔ آربن نے شاہ قبرص کو شہر کے باہر تک ملکہ کے استقبال کے لیے بھیجا۔ شہر کے بھاٹک پر کارڈنل اُمرا اور بہت سے جاگیردار کھڑے تھے اور سینٹ پیٹر کے گرجے کے زینے تک آ کے خود پوپ نے ملکہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایسی صورت دیکھتے ہوئے چارچھ زینے نیچے اتر آیا۔ اور بڑے شوق سے ملا۔ آربن ملکہ جو آنا کا بہت ممنون تھا کہ نے اُسے ایسے وقت میں اپنی دوستی کی عزت بخشی تھی جب وہ معمولی پادری تھا اور اُسے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ یہ بات خود اُس کے یا کسی اور کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ایک دن وہ حضرت مسیح کا نائب بن کے تخت پاپائی پر رونق افروز ہو گا۔ یہ عزت اُسے محض ملکہ کی کوشش اور کارڈنلون میں ملکہ کا اثر ہونے کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ پوپ ہونے کے بعد یہ بھی تھا کہ ملکہ اُس کی ہر بات کو قبول کر لیتی اور اُس کی تائید پادادہ ہو جاتی تھی۔ پوپ نے جو آنا کو ساتھ لے جا کر سب سے پہلے پیٹر اور پال کے مقبروں کی زیارت کرائی۔ پھر اپنے شاندار محل میں لے گیا۔ اور اس کے بعد یہ حالت ہوئی کہ محل کے اندر رات دن پوپ اور ملکہ جو آنا میں ملاز و نیاز کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔

جو آنا کے روم میں آنے سے پہلے شاہ قبرص کو دربار پاپائی میں بہت خوش حال تھا۔ مگر جو آنا کے آنے ہی وہ تشریف لے گیا۔ اور اب جو کچھ بھی جو آنا تھی کل اُسور اُس کی اشارے پر اور اُس کی مرضی کے مطابق انجام پاتے۔ اور چند روز میں اہل روم کو اس کا ایک اور ثبوت بھی مل گیا کہ پوپ کے دل میں ملکہ کی کتنی قدر و منزلت تھی۔

قدیم زمانے سے ایک دستور یہ چلا آتا تھا کہ اہل ردا اگر حج کی ایک مخصوص رسم کے موقع پر ہر سال ایک گلاب کا پھول پوپ کے نذر کیا کرتے۔ اس دینی رسم کے ادا کرنے وقت وہ پھول پوپ کے سینے پر لگا رہتا۔ مگر رسم ادا ہو جانے کے بعد پوپ اُس پھول کو اپنے ہاتھ سے کسی ایسے معزز شخص کے سینے پر لگا دیتا جس کی عزت اُن کی نظروں میں سب سے زیادہ ہوتی۔ یہ ایسی عزت تھی جس کے لیے ہر معزز شخص آرزو مند رہتا۔ اور اس مرتبہ سب کا یہ خیال تھا کہ وہ پھول شاہ قبرص کو ملے گا۔ مگر سب کا روناؤ اور خود شاہ قبرص کو یہ دیکھ کے بڑا تعجب اور مایوسی ہوئی کہ مذہبی رسوم ادا ہونے کے بعد پوپ آربن نے وہ تبرک گلاب کا پھول ملکہ جونا کے مرتبہ لگا دیا۔ مناسبت کے لحاظ سے پھول ملکہ ہی کر لیتا چاہیے تھا مگر یہ دیکھ کے سب شائے میں رہ گئے۔ اور کارڈنلو سم خاموش نہ رہا گیا۔ انھوں نے پوپ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس سے پہلے کبھی یہ عزت کسی عورت کو خواہ وہ کسی مرتبہ اور درجے کی ہونین میسر ہوئی ہے۔ خصوصاً اس موقع پر جبکہ ایک معزز فرمانروا بھی موجود ہے۔ یہ مناسبت نہیں معلوم ہوتا کہ اُسے محروم کر کے ایک عورت کو اس کی عزت دی جائے۔ پوپ نے بڑی بے پردائی کے ساتھ جواب دیا کہ اس سے پہلے کبھی تم نے ایک معمولی اور ادنیٰ درجے کے پادری کو بھی تخت پائنی پر نہ دیکھا ہوگا۔

قواعد اردو۔ مولفہ مولوی عبدالحی صاحبہ بی۔ اے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن۔ اس کا پہلا ادیشن ۱۳۱۲ھ میں الناظرین نے لکھنؤ میں چھپا تھا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کے نائب رئیس میں چھپا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب اردو کی کتابیں اب میں چھپتی جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہی ایک کتاب ہے جس میں زبان اردو کے قواعد صحیح ہول پر مرتب کیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے جتنے قواعد لکھے گئے۔ وہ عربی اور فارسی کے اتباع میں تھے اور وہ کسی طرح زبان اردو کے لیے موزوں نہ تھے۔ اردو اپنی نوعیت کے لحاظ سے آربن زبان ہے اس کی بندشیں۔ تمکینیں۔ اس کے الفاظ و افعال کے اشتقاق کے طریقے اور قواعد سے بالکل بھکا کے ہیں۔ عربی اور فارسی کے جذبات اور جموعا اسماء اللہ اہل ہو گئے ہیں ایسی حالت میں اردو کے قواعد میں عربی اور فارسی کا تتبع کتنا برا ظلم ہے۔ ان امور کو ہمیش نظر رکھ کے یہ قواعد مرتب کیے گئے ہیں جو اردو کی ایک قابل فخر تصنیف ہے۔ اس ایڈیشن میں ”روز اوقاف“ اور ”عروض“ کے ابواب اضافہ کر دیے گئے ہیں۔ قیمت جلد دو روپہ آٹھ آنہ۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے منگوا کے ضرور دیکھیے۔



(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب کنوارا لہجہ غمانیہ یونیورسٹی جید رٹا دکن)
 اکبر کے عہد اقبال و کامرانی میں ایسے ایسے جادو بیان فارسی شعرا نے اس ملک میں نغمہ
 خوانی میں کہ محمد و سنجہ کا زمانہ یاد آگیا نظیر غوری، عرفی، اور قحی کے کلام کی آج تک
 عالم ادب میں گونج باقی ہے اور فارسی شعر کا ہر قدردان اُن کے نام اور کارناموں سے
 آگاہ ہے۔ مگر ان مشہور اساتذہ کو چھوڑ کر اس مضمون میں ہم صرف اُن اکبری شعرا
 کی یاد تازہ کریں گے جو اتنے زیادہ مشہور نہیں اور جن کے پُر لطف کلام اور محاضرات
 میں اس عہد کے ذوق و شائستگی کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے۔

۱۔ ملاحات اسم کاہی

کاہی بلکہ خراسانی آدمی تھا اور ہر چند سن کمولت میں ہندوستان آیا لیکن ایک
 سو دس برس اور بعض تذکروں میں دیکھا کہ ایک سو بیس برس کی عمر پائی۔ لہذا ہندوستانی
 ہو جانے میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس بد نصیب ملک سے کوئی اپنے آپ کو منسوب کرنا نہیں
 چاہتا۔ خراسان کے پیاروں کا یہ سیہ فام و ہفتانی بھی کشور ہندوستان پر اس طرح
 طعنہ زن ہے کہ

کاہی تو بلبل چین آراے کاہلی زارغ و زغن نئی کہ نیند وستان شوی!
 شاید اس کی درازی عمر سے ہی اکتا کر یاروں نے خبر اُڑادی کہ قاسم
 کاہی مر گیا اس کا ہم چشم غزالی شاہی لشکر کے ساتھ گجرات میں تھا وہیں یہ خبر سنی
 اور قطعہ تاریخ بھی لکھ مارا۔

رفت بیچارہ کا ہی از دنیا سال تاریخ ادا اگر خواہی
 چون بیچارہ رفت شد ناچار از جہان رفتہ تسم کاہی
 اتفاق کی بات کہ تھوڑے ہی دن بعد خود غزالی نے ہجرات میں یکبارگی
 وفات پائی۔ کاہی نے بدلہ لیا۔ اور ایک ہجو یہ قطعے میں ع
 ”ملحد دو نے رفت ز عالم“
 سے تاریخ نکالی۔ اسی درازی و سن پر سلطان سے جو لطیفہ ہوا۔ اس کی نقل
 آگے آتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے ملا قاسم کی شاعری موسیقی کے ساز پر دوڑتی تھی۔
 وہ اس فن میں یگانہ روزگار تھا۔ اور اپنی غزلوں کے لئے بھی خود ہی مقرر و مرتج
 کر دیتا تھا چنانچہ یہ دو اُن دنوں ملک ملک میں گائی جاتی تھیں:—
 (۱) مرغ۔ اب فرق مجھوں پر زدن انگیز کرد آتش سوداے لیلی در سراوتیز کرد
 (۲) چون ز عکس عارضش آئینہ پر گلی شود گردان آئینہ طوطی بنگر دبلبل شود

ایک عزیز کی مدح و شکر گزاری میں جو دردِ پا کے باوجود عیادت
 کے لئے آئے تھے لانے فی البدیہ غزل تیار کی۔
 ماندی قدم ز باز بروے نیاز من دروے بناو پائے ترا سرونا ز من
 ہر خند و صف و صل تو کردم شب فراق کو تہ نگشت قصہ درد دراز من

ایک پُر لطف غزل تھی کے ترازے اور بادشاہ کی تعریف میں لکھی ہے۔
 بافیضانِ میل دیدم دستانِ خویش را بہ صرفِ راہِ فیل کروم نقد جانِ خویش را
 خاک بر سرِ سینگم چون فیل ہر جامی رسم گرنہ بینم بر سرِ خود فیلِ بانِ خویش را
 شاہ فیل افکن اجلال الدین محمد اکبر است آئکہ بخشید فیل ز ترین شاعرانِ خویش را

اس غزل کا بادشاہ نے ایک لاکھ تنگہ صلہ دیا اور حکم دے دیا کہ ہر دفعہ
 جب ملا دربار میں آئے ایک ہزار روپیہ ”پامرد“ دی جائے مگر شاعری

کی نشان استغنا دیکھیے کہ اُس کے بعد سے پھر شاہی دربار میں کبھی نہ گیا۔
بوستان سعدی کے جواب میں ایک مثنوی ”گل افشان“ لکھی تھی اور
قافیے سے قافیہ ملکرا یا تھا۔ اس کا صرف مطلع دیکھنے میں آیا۔

جان آفرین را بجان آفرین بجان آفرین صد جان آفرین
کاہی کے کلام پر ملا عبد القادر بدایونی کی ناقدانہ راس یہ ہجر کہ ”شعر اور بیار خام است
وہمہ مضمون دیگران۔ آہدیت مجموعی دار کہ ہچکس دران وادی باوثر نہایت“ دوسرے ہجرت
بیاضی قرالی و کتاہیئے محاکمین یراعی یادگار چھوڑ گیا ہے۔

کاہی وغرالی۔ آن دو لا یعقل است در غیت جامی و توای زوہ است
در دہر کے پٹیل ایشان نگشت کاہی چہس است و ہم غزالی چہ گشت

ابو افضل نے اشارہ اور ملا صاحب نے صراحت کی ہے کہ علم و فضل کے باوجود اور
مولوی جامی وغیرہ بزرگان صوفیہ کی صحبت پانچ کے باوصف کاہی نہایت آزاد
درند مزاج آدمی تھا۔ دنیا بھر کے آوارہ گرد وادبش اس کے گرد و پیش جمع رہتے
اور کتوں کا بھی بہت شوق تھا۔ سو جلد دل ملا صاحب کے بقول یہ اعتلاط باسگان تو
شرط ایک اشعار ہی ہو گیا تھا۔

۸۸ھ میں وفات پائی۔

۲۔ بیکسی غزنوی

نہایت متقی صاحب علم و فضل بزرگ تھا۔ دربار میں دریدہ دہن۔ نیاززی نے یہ فقرہ
کہ ”چہ کنیم ابیک نیم۔ روسے بیکسی سیاہ“ اُسی پر چست کیا تھا۔ اس کا قصیدہ و رقصہ مشہور ہے
کہ ایک مرتبہ تہا لون بادشاہ نے قیام گاہ دہلی کے طاق پر شیخ آذری کا یہ مطلع اپنے
قلم سے بہت خوشنظر تحریر کیا۔

شنیدہ ام کہ بر این طارم ز راند دست خط کہ عاقبت کار جملہ محمود است
اتفاق سے چند ہی روز کے بعد اُسی مکان کے کوٹھے سے گر کر وفات پائی اور
یہ شعر لکھا بھی مرنے والے کی کراست در دشمن ضمیری سمجھا گیا۔ ملا بیکسی نے اس پورے

واقعہ کو اس طرح نظم کیا ہے :-

در نیکہ شاہ ہایون بوقتِ رحلتِ خویش
نوشت بر درِ سرِ منزلِ کہ ساکن بود
تخطی کہ عاقبتِ کارِ جملہ محمود است
بحسنِ عاقبتِ خود اشتار تے فرمود
چو شد بحکمِ قضا منزلش بہانِ منزل
کہ بود قبلہ حاجات و کعبہ مقصود
بنابرین پئے تاریخِ رحلتش گفتیم
بنامِ منزلِ سلطانِ عاقبتِ محمود

۳۔ توسنی

ساجھ کے راجہ لون کرن کا بیٹا منوہر نام فارسی میں خوب شعر کہتا تھا جس
ذوق اور ذہانت کے بدولت لوگ منوہر کہنے لگے اور ہندو باپ نے بھی اس پر
فخر کیا۔ لیکن یہ بات خود اکبر کے خلاف طبع تھی۔ آخر منوہر خطاب دے کر بین
راہ کی۔ یہ تخلص بھی بادشاہ کا عطا کردہ تھا۔ اس واقعے کی یادگار میں جو شعر اس نے
کہے ان میں سے دو یہ ہیں۔

شربتِ آشنا اسیدِ بزمِ مادرِ دی کشان
کرمگر در کف کباب و خونِ دل در ساغرِ است
توسنی سرہ سند عشق در میدانِ عشق
میرسی امین بقصدِ رہرت چون اکبر است

عشق حقیقی کے جوش میں ایک رباعی لکھی کہ نقل کرنے کے قابل ہے۔

بے عشق تو در جگر لبالب نار است
بے در تو در سرم سرا سر خار است
تجانبہ و کعبہ ہر دو نزد م کفر است
مارا بہ یگانگی ایزد کار است

۴۔ خنجر بیگ

چنتائی امیر اور فاتحِ دہلی تری بیگ خان کا داماد تھا۔ فنونِ سپہ گری
کے ساتھ موسیقی، خوش نویسی، شعر و نجوم وغیرہ علوم و فنون میں بڑی دست گاہ ہم
پہنچائی۔ دیوانِ اشعار کے علاوہ تین سو شعر کی ایک مثنوی لکھی جس میں بہت خوبی
سے بادشاہ کو نصیحت کی ہے۔ مثنوی اور اسلوب و نون اس قابل ہیں کہ ذیل
میں اُس کے جتنے بے سب شعر نقل کر دیے جائیں۔ دوسرے مجھے امید نہیں کہ

منتخب التواریخ کے سوا اور کین یہ مثنوی محفوظ رہی ہو کیونکہ چند ہی سال بعد خیرنگ بھی از بکیر کی شورش میں حصہ دار تھا۔ اور شکست کھا کے بنگالے بھاگا۔ اور پھر اس کی خبر نہ ملی۔

مثنوی

شہر یار جہان عجب جائے ست
ہر زمان اندر و تماشاے ست
یہ رخ نیزنگ ساز شعبہ باز
ہر زمان بازیے کد آغانہ
پیش ازین بودہ اند در عالم
تاجداران با سپاہ و حشم
نہان دلیران یہ ہوا و ہوس
ماند تار بخساکے کمنہ و بس
گر بنیا ثبات دیدند سے
انبار و چرا میرند سے
خسرو اکار این جہان حسود
این چنین ہست و بود و خواہد بود
زین ہمہ کار و بار پشیم و بیج
نام نیک است اصل و آن ہمہ تیج
غرض این بود ز پشیم ستیج
تو نوبت رسید تا چہ کئے
حق نگہدار بادت از آئیب
این زمان کہ تو یافت عالم زیب
بسر تا تو باشی سایہ تنگن
گر جہاں پہرہ اندہ پشیم کشن
سخن میں کہ بے ریا باشد
چون بہ خیریت تو می گویشم
سخن زید یا کہ عمر بود
شاہ باید کہ در گد و بیگاہ
سہو مسکین زیان مان باشد
بگدا فکر خلق و ولق بود
چون ترا نوبت جہان دارست
بہ شود کار سلطنت تو زک
تو چو ستمی و ملک تو حسانہ
چون ترا نوبت جہان دارست
ذرہ نبود چو نور خود نبود
تو شہانہ شمع گر نبود
یعنی از قست زندگی ہمہ
تو شبانی و اہل ملک رہ

بجز آگاه همت آمده است گلکه
 به تو فرمود حق نگهبانی
 پس مکن رسم انبیا را گم
 عمر خوش گوهریت قیمت دان
 بادشاهی ز لے شعاری تو
 عدل و انصاف وجود و علم سخا
 همه داری ز لطف نیندانی
 تو به خنده بفیل مست سوار
 تو بدندان فیل و مشت زنان
 تو ز خرطوم فیل خجسته کشا
 تو مقابل به آشیر درنده
 تو به جنگ پلنگ بازی کن
 تو ستاده به پیش حمله گرگ
 تو گلو گیر از در سهم
 تو شناور به بحر بے پایان
 تو به چنگل بے شکار درون
 تو شب تیره رفته یکم راه
 تو بسر پا برهنه گردیده
 تو به گردان بجایه درخت
 تو پاد به هر طرف رانده
 تو به تپیدن ان خشم جنگ آور
 این چه لطف است و این چه غواری
 این دلیریت دور از آئینه
 گر چه اینها هنر بود بے ریب
 شاه اگر دور از زبان باشد

گلکه را چون توان گذاشت یله
 منصب انبیاست چو پاستی
 از خود آگاه باش و از مردم
 دولت ملک را غنیمت دان
 در جهان از براس کار تو
 لطف و احسان خلق و مهر و وفا
 چکنم قدر خود نمی دانی
 خلق در گریه بر سر دیوار
 مردم انگشت فکر در دندان
 آستین ما نشانده از دنیا
 مردم از و هم بر طرف کنده
 روکنان ما به خجسته و ماخن
 به تعجب ز دور خرد و بزرگ
 خلق و عالم به بیج و تاب ز و هم
 بر لبش دست شسته از جان
 خلق از ترس و و هم از بیرون
 مردم از بے بنو و شعل آه
 خلق در زیر جامه لرزیده
 خلق غرق عرق به زیر درخت
 ما سواره ز کوفت در مانده
 لشکر از هر طرف تماشاگر
 که با و به خویشتن داری
 این شجاعت بتو بود تا زده
 لیک از بادشاه باشد عیب
 مردم ملک در امان باشد

شاہ از خویش اگر بود بے غم
ہمہ زید و زبر شود عالم
باتو ماراجان و حبان باید
بے توجہ جان و حبان چکار آید
خجہ غور در حصول کمن
خاطر شاہ را کول کمن
این حدیث تو دور از معنی است
شاہ ازین گفتگو مستغنی است
او چو پیش خداے مقبول است
دولت او بکار مشغول است
خواب او بہت عین بیداری
مستی او کمال ہشیاری
حق یہ کہ کسی کہ کار ساز بود
از ہمہ کار بے نیاز بود

۵۔ سلطان سبکی

محمد سلطان نام قندھار کے قریب ایک گاؤں سبکی کا رہنے والا تھا ہندوستان میں آیا۔ تو ظریفون نے اس نام کو مہند کر کے چبکی کہنا شروع کیا۔ اس پر بہت ہنستا اور بگڑتا تھا کہ کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ نہایت ظریف و آزاد مزاج آدمی تھا۔ ایک دن ملا قاسم کا ہی سے پوچھنے لگا کہ سن شریف کیا ہو گا؟ ملا نے جواب دیا "اللہ میاں سے دو سال چھوڑا ہوں" سلطان نے برجستہ کہا "آپ کیا فراتے ہیں میں تو آپ کو دو سال بڑا جانتا تھا" قاسم کا ہی بہت ہنسا اور کہا تم ہاری محبت کے لائق ہو۔

لیکن سلطان کی زندگی کا عجیب واقعہ ملا عبدالقادر نے یہ بیان کیا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ خان زمان خان کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ خان زمان خان نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت صلے میں دیا۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ میری خاطر سے یہ تخلص چھوڑ دو۔ کیونکہ خود خان زمان کا تخلص بھی سلطان تھا۔ شاعر نے یہ سن کر خلعت و صلہ لینے سے انکار کیا۔ اور کہا "سلطان محمد" میرے باپ کا نام ہوا نا۔ ہے۔ اور تم سے سالہا سال پہلے سے میں اس تخلص سے شعر کہتا۔ اور شہرت حاصل کر چکا ہوں۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔

خان زمان جس قدر فیاض و دلیر تھا۔ ویسا ہی حکم نبد و شعلہ خوبھی تھا۔ بزمِ راج ہو کے کہنے لگا۔ اگر تخلص نہیں چھوڑتا تو مجھے ہاتھی کے ایچھے ڈال کے ہلاک

اور اُمرا کو یہ مشورہ دیتے کہ اپنی شادی شدہ بیویوں کو طلاق دے کر چھوڑ دیں۔ اور جس سے چاہیں شادی کر لیں۔ کبھی بادشاہوں کی درخواست پر بھی بیویوں کی طرف سے ایسی اجازت دے دی جاتی۔

پوپ آرن پنجم نے بھی اپنے اس اختیار سے کام لیا۔ طلاق کی اجازت دینے کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ پوپ خود ہی کسی عقد کو مسترد قرار دے دیتے۔ اس معاملے میں بھی پوپ نے وہی صورت اختیار کی۔ اور جو ان کے ساتھ جمیس شاہ تجارت کا عقد ناجائز قرار دے کر مسترد کر دیا۔

اس کے بعد ہی پوپ آرن کے لیے بڑی مصیبت کا وقت آیا۔ اٹلی کے حکمران یکبارگی اُس کے مخالف ہو گئے۔ اور ہر طرف قتل و خونریزی کا بازار گرم ہو گیا۔ جو ان عیش و عشرت کی دلدادہ تھی۔ اس مصیبت میں جو ان نے اپنے عاشق زار آرن کے ساتھ تکلیفیں برداشت کرنے کے بجائے زیادہ مناسب خیال کیا کہ اُسے چھوڑ کے خود اٹلی سے چلی جائے۔ وہ نیپلز میں واپس آ کے اپنے درباری امرا کے ساتھ عیش و عشرت میں مشغول ہو گئی۔

اٹلی کے ان چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے خلاف پوپ نے اپنا سارا زور اور کل مذہبی اختیارات صرف کر دیے۔ مگر کسی سے کام نہ چلا۔ آخر مجبور ہو کر شہنشاہ چارلس سے مدد مانگی اور وہ بیس ہزار سپاہ کے ساتھ پوپ کی حمایت میں چلا۔ مگر اس کے پہنچنے تک، بھی پوپ کو وہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ نظر آیا۔ وہ جب سے اٹلی میں آیا تھا طرح طرح کی مصیبتیں اور پیریشانیان ہر وقت موجو رہتی تھیں۔ اٹلی کے باشندے جان یہ دیکھتے کہ کوئی حکمران زیادہ قوی ہو جا جائے۔ اور ہمیں دبا لے گا فوراً اس کے خلاف ہو جاتے اور کوئی بڑی قوت نہ قائم ہونے دیتے۔ ان فکروں سے پوپ آرن کو ایک دن بھی اٹلی میں آنے کے بعد چین سے بیٹھنا نہ نصیب ہوا تھا۔ اور انھیں فکروں میں اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔

آرن کو اب اس کا بڑا افسوس ہوا کہ میں نے ناحق اُس امن و امان کی جگہ آئے وگن کو چھوڑ کے یہ سب مصیبتیں اپنے سر بول لیں۔ اسے سرزمین فرانس کے امن پسند اور خوش اخلاق باشندے یاد آنے لگے۔ اور دریائے رون کا وہ دلفریب

کنارہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا جہاں وہ خوشنمندی سرسبز مغزاوروں اور زیتون سے ڈھکی ہوئی ہاٹریوں میں سے ہو کے گزری تھی۔ اب اُسے یہ معلوم ہوا کہ اس سرزمین کو قدرت نے ہی ایسی اچھی آب و ہوا عطا کر کے عیش و عشرت کا گہوارہ بنایا ہے۔

کارڈنل تو پہلے ہی تو وائیں آنے کے خلاف تھے۔ اُن کا یہ زمانہ گویا جلا وطنی میں گزارا تھا۔ سب نے یزبان ہو کر پوپ کو آسے وگ نن واپس چلنے کی صرف رائے ہی نہیں دی بلکہ بڑی عاجزی سے درخواست کی۔ آرن دل میں تو بھی چاہتا تھا مگر کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اتفاقاً اسی زمانے میں فرانس اور انگلستان میں جنگ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ پوپ نے کہا کہ میں وہاں ہونے کے و دونوں سلطنتوں میں سمجھوتہ کرادوں گا۔ یہ خیال ظاہر کر کے پوپ نے آسے وگ نن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

آسے وگ نن سے چلتے وقت پوپ آرن کی جس قدر مخالفت ہوئی تھی اُن سے بہت زیادہ رد و اچھوڑنے وقت ہوئی۔ مگر آرن نے کسی کی پروا نہ کی۔ اوار آسے وگ نن جانے کے لیے پھر اپنی مہربان ملکہ نیپلز سے جہاز مانگے۔ اُسے کیا قدر ہو گئی تھا۔ وہ تو آرن کی ہر خواہش قبول کرنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ فوراً پرتھک جہاز بھیج دیے۔ اور پھر دربار باپائی مع اپنے کل لوازمات کے مدیاسے اردن کے کنارے سرزمین فرانس میں پہونچ گیا۔ اور آرن بڑی شان و شوکت کے ساتھ آسے وگ نن میں داخل ہوا۔ لوگ اُس کے استقبال میں خوشی کے غرے بلند کر رہے تھے۔

آرن کو یہاں آ کے خوشی تو ہوئی مگر جتنا زمانہ اُملی میں گزارا اس میں سے ایک دن بھی اُسے چین سے بیٹھنا نہیں نصیب ہوا تھا۔ ان فکروں نے اُسے گھلا دیا۔ اور آسے وگ نن آنے کے دو ہی تین مہینے بعد اس نے انتقال کیا۔ اس کے مرتے ہی جواما کی قوت و اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ تین پوپ جواما کے سامنے گزرے تھے جن میں سے دو کے زمانے میں دراصل اُسی نے دین سیجی کی رہبری کی اور سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں وہ کسی سے ناراض ہوئی فوراً ایک باپائی فرمان اُس شخص کے خلاف جاری ہو گیا۔ اور اکثر امرا و جاگیردار مٹھن جواما کی ناراضی کی بدولت دینی حقوق سے محروم کر دیے گئے۔ مگر اس کے بعد اُس کی

ساری قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور آخری عمر پریشانیوں میں بسر ہوئی۔ چند روز بعد جیمس شاہ مجارہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور جوانانے اپنا جو تھا عقد بربکس وک کے سردار آتھو کے ساتھ کر لیا۔ اس وقت اسکی عمر چھیالیس سال کو پہنچ چکی تھی۔ مگر اب بھی محسن و دلکشی کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوگ اس کے آرزو مند تھے۔

دربار پاپائی میں اب بھی اکثر کارڈنل جوانانے کے طے شدہ اور قدر دان تھے۔ جوانانے اپنی مرضی کے مطابق پھر ایک ٹیبلز کے پادری نکولاس کو پوپ منتخب کر دیا جس نے اپنا لقب پوپ آربن ششم رکھا۔ مگر انیسویں صدی کی ہی سب سے بڑی غلطی تھی اس نے نکولاس کو بالکل نہیں پہچانا تھا۔ یا اسے بڑا دھوکا ہوا۔ جیسے ہی نکولاس نے پاپائی اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا وہ ملکہ جوانانے کے خلاف ہو گیا اور اسکی ساری مہربانیوں اور معنایتوں کو بالکل بھلا دیا۔ اس نے ملکہ کے خلاف سختی کرنا کامیاب جاری کرنے کا ارادہ کیا تو ایک میٹر کارڈنل نے سمجھا یا کہ ملکہ جوانانے کی مخالفت ٹھیک نہیں کیونکہ دو پوپوں کے زمانے میں اس نے بڑی عمدگی سے گرجے کی خدمت کی ہے اور اسی کے ذریعے سے پاپائی اقتدار کو ترقی نصیب ہوئی۔ مگر اس ناشکرے پوپ نے جواب دیا کہ میں اس ملکہ کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ اور تم دیکھنا کہ عیش و عشرت کرنے کے بجائے چند روز میں وہ کسی خانقاہ میں بیٹھی جو خاکات رہی ہوگی۔ آربن ششم جوانانے کا علانیہ دشمن ہو گیا۔ اور ملکہ کی جانب سے جو سفیر آنا اس کی تحقیر و تذلیل کرتا۔

یہ پوپ عجیب طبیعت کا واقع ہوا تھا۔ اس کی اپنے میٹر کارڈنلون سے بھی نہ بنتی تھی۔ پوپ کارڈنلون کو اپنا غلام سمجھتا اور اس کے برتاؤ کی عام طور پر بھی شکایت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پوپ اور کارڈنلون میں مخالفت پیدا ہو گئی کارڈنلون اسے چھوڑ کے چلے گئے۔ اور ایک جگہ جمع ہو کے انھوں نے جلسہ کیا۔ جس میں یہ سٹے پایا کہ آربن ششم کا پوپ منتخب ہونا مسترد کر دیا جائے اور کوئی دوسرا شخص پوپ منتخب ہو۔

جوانانے اس وقت نہایت سچائی کے ساتھ اسکی کوشش کی کہ پوپ اور کارڈنلون میں جو جھگڑا پیدا ہو گیا ہے رفع ہو جائے۔ مگر پوپ آربن ششم نے یہ خیال کیا کہ ملکہ ہی کی سازش سے کارڈنلون نے یہ جھگڑا شروع کیا ہے۔ لہذا اس نے جوانانے

کے پاس نہایت ہی سخت الفاظ میں ایک خط لکھا جس میں ملکہ کے عشق و محبت کے گزشتہ واقعات گنوائے تھے۔ لکھا تھا کہ تم ہی نے اپنے پہلے شوہر آئڈر کو قتل کیا۔ پھر پوپ کلیمنٹ ششم اور پوپ آرنہم کے ساتھ کیسی شرمناک زندگی بسر کی ہے۔ یہ لکھنے کے بعد پوپ نے اُسے دھکی دی کہ میں تمہاری کل عشق بازیوں کے راز آشکارا کر کے تم کو مذہبی حقوق سے محروم کر دوں گا۔ اس خط کے الفاظ ناقابل برداشت تھے اور نیپلز کی ملکہ کے جانب سے بھی ویسا ہی ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا اب جو انا نے بھی پوپ سے علانیہ مخالفت اختیار کر لی اور اُن کا ردِ نون کی طرفدار ہو گئی جو پوپ سے ناراض ہو کر دربارِ پاپائی سے چلے آئے تھے۔ اُنھیں اپنی سلطنت نیپلز میں پناہ دی اور اُنھوں نے مقامِ فونڈی میں اپنی مجلس قائم کر کے اپنی پہلی تجویز کے مطابق آرنہم ششم کے انتخاب کو مسترد کر کے جو انا کے مشورے کے مطابق نیپلز کے کارڈل رابرٹ کو پوپ منتخب کیا جس نے اپنا لقب پوپ کلیمنٹ ہفتم قرار دیا۔

اب مسیحی دنیا میں دو پوپ تھے جو ایک دوسرے کو گالیان دیتے۔ اور باہم لڑ رہے تھے۔ اور یورپ میں مذہب کے دو فرقے ہو گئے۔ جو انا کلیمنٹ کی طرفدار تھی۔ جب مقامِ فونڈی کی حالت غیر محفوظ نظر آئی تو اُس نے جدید پوپ کا دربار ایک دوسرے مقام پر قائم کر دیا۔ اور چند روز بعد وہ خاص مقام آئے وہی میں پہنچ گیا۔

آرنہم ششم نے جو انا کی مخالفت اور اس کے بدنام کرنے میں کوئی بات نہیں اٹھا رکھی۔ یورپ کے بادشاہوں سے درخواست کی کہ اس پر فوج کشی کر کے نیپلز کی حکومت سے معزول کر دیں۔ اور ون کو تو اتنی غرض نہ تھی مگر جو انا کے پہلے شوہر آئڈر کا بھائی لوئی شاہ ہنگری ابھی زندہ تھا۔ اُس نے پہلے ہی ملکہ جو انا کو نیپلز سے نکال باہر کیا تھا۔ مگر پوپ کلیمنٹ ششم کے کہنے سننے سے ملکہ کا عداوت چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت وہ پھر حملہ آور ہوا۔

جو انا کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس نے اپنی بھانجی مارگریٹ کی شادی چارلس ڈرازور کے ساتھ کر دی۔ اور چارلس کو اپنا جانشین بھی مقرر کر دیا۔ مگر اُس نے جو انا کے ساتھ وفا کی۔ اس مصیبت میں ملکہ کی مدد کرنے کے بجائے وہ خود بھی نیپلز پر حملہ آور

ہوا۔ اور جو آنا اس کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئی۔ چارلس یہ چاہتا تھا کہ جو آنا اسی وقت تخت سے دست بردار ہو کر اُسے اپنا جانشین بنا دے۔ مگر اُس کی اس حرکت سے جو آنا ناراض ہو گئی۔ اور اُسے اپنی سلطنت نیلے کی وراثت سے بھی محروم کر دیا۔ چارلس نے جو آنا کو ایک قلعہ میں بند کر دیا۔ اور طرح طرح کی تکلیفیں دینا شروع کیں۔ تاکہ وہ مجبور ہو کر تخت سے دست برداری پر آمادہ ہو جائے۔ مگر جو آنا نے کسی طرح نہ مانا۔ اسی قید خانے میں جو آنا سو رہی تھی کہ ایک رات کو اس قدر کھڑے اور تکیے اس کے موہنے پر رکھ کے دبائے گئے کہ اُس کی سانس رک گئی۔ اور اس کا دم نکل گیا۔ اس افسوس ناک طریقے سے اس عیش و عشرت کی ولادہ حسین ملکہ کا سلسلہ ۶ میں خاتمہ ہو گیا۔

نخستان کے یہودی نصاریٰ کا انجام

سلسلہ ۸ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید کو قہوڑا لشکر دے کے بنی حارث بن کعب کی جانب روانہ کیا۔ یہ قبیلہ علاقہ حجران میں رہتا تھا۔ جس میں زیادہ تر یہودی اور کچھ مسیحی تھے۔ رسول اللہ صلعم نے حضرت خالد کو یہ حکم دیا کہ وہ ان پوچھ کر بہ آواز بلند تین دفعہ اُن کو دعوت اسلام دینا۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو تم خود اُنہیں لوگوں میں بٹھرا دینا۔ اور اُنہیں اسلام کی تعلیم دینا۔ لیکن اگر وہ اسلام نہ قبول کریں تو اُن سے مقابلہ کرنا۔ افران رسالت کی تعمیل میں حضرت خالد بن ولید وہاں پہنچے دعوت اسلام دی۔ جسے یہودیوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ اور اسلام لائے خالد اُنہیں میں بٹھرا گئے۔ اور رسول مقبول (صلعم) کو اُن کے اسلام قبول کرنے کی اطلاع کر دی۔

چند روز بعد حضرت خالد وہاں سے واپس چلے۔ تو بنی حارث کا ایک وفد اُن کے ساتھ ہوا۔ یہ لوگ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ اور چند روز بعد واپس گئے۔ رسول اللہ (صلعم) نے عمر بن حزم کو اُن لوگوں

میں بھیجا کہ شریعت اسلام کی تعلیم دین۔ اور اُن سے صدقات کی رقم وصول کیا کریں۔ غزیر بن حزم و مین تھے۔ اور اپنی مفوضہ خدمت انجام دے رہے تھے کہ رسول اللہ صلعم نے سفر آخرت فرمایا۔

لیکن خیران کے عیسائیوں کا یہ واقعہ ہے کہ اُغنون نے عاقب اور سید نام اپنے دو شخصوں کو اور چند لوگوں کے ساتھ بارگاہ نبوی میں بھیج کر آپ سے مباہلہ کرنا چاہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی مرتضیٰ فاطمہ زہرا اور حسین علیہم السلام کو ساتھ لے کر مباہلے کے لیے نکلے۔ اُن لوگوں نے آپ کے اُن نورانی چہروں کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ یہ تو ایسی صورتیں ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو قسم دلائیں تو وہ ہمارے دون کو بھی ان کی جگہ سے ہٹا دے اور اُن کے دلوں پر ایسا رعب طاری ہوا کہ مباہلے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور اس اقرار پر صلح کر لی کہ ہر سال دو ہزار ٹھلے بھیجا کریں گے۔ ان میں سے ہر ٹھلے کی قیمت چالیس درہم ہوا کرے گی۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلعم کے بھیجے ہوئے لوگوں کی مہمان داری بھی اُنھیں کے ذمے ہوگی۔ اس کے معاوضے میں اُن سے وعدہ کیا گیا کہ اُنھیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دی جائے گی اور اس بنا پر اُن کے ساتھ کسی قسم کی سختی نہ کی جائے گی۔

آپ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا۔ اُن میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ یہی برتاؤ رہا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں خیران کے مسیحیوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس ہزار کو پہنچ گئی۔ اس زیادتی کی وجہ سے آپس میں ہی رقابتیں پیدا ہوئیں اور یہاں تک حسد بڑھا کہ اُن کے سر پر آؤر وہ لوگ خود ہی حضرت خیر بنی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ آپ ہمیں کہیں اور بھیج دیجئے۔ حضرت عمر کو اُن کی کثرت کی وجہ سے مسلمانوں کے حق میں اندیشہ نظر آتا تھا۔ اُن کی اس درخواست کو غنیمت جانا۔ فوراً اُن کی کل جائیداد اور مال و اسباب کی قیمت ادا کر دی۔ اور اُنھیں شام اور حوالی کو قہ میں جگہ دی۔ جلاوطن ہونے پر بھی وہ مقررہ خراج برابر ادا کرتے رہے۔

حضرت عثمانؓ نے اس خراج میں دو سو حُلُون کی تخفیف کر دی۔ جب حضرت علیؓ کا زمانہ آیا اور آپؓ نے کوفے کی سکونت اختیار کی تو وہ لوگ آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے وطن واپس جانے کی اجازت چاہی حضرت علیؓ نے فرمایا کہ عمرؓ نے جو کچھ کیا مناسب کیا۔ میں اس کے خلاف کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔

اس کے بعد حضرت معاویہؓ اور یزید بن معاویہ کا زمانہ ہوا تو ان کے درباروں میں جا کے ان لوگوں نے یہ ظاہر کیا کہ ہماری جماعت منتشر ہو گئی۔ ہم میں سے بہت سے مسلمان ہو گئے۔ اور بہت سے مر گئے۔ یہ واقعہ تھا کہ اب ان کی تعداد بہت گھٹ گئی تھی لہذا یزید نے دو سو حُلے اور گھٹا دیے۔

عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں حجاج والی عراق ہوا عبدالرحمن بن محمد بن اشعث نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ بد قسمتی سے بخراہنوں نے بھی عبدالرحمن کا ساتھ دیا تھا۔ اس الزام میں سزا کے طور پر ان کے ذمے تیرہ سو حُلے بڑھا دیے گئے۔

اب عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا۔ یہ لوگ شکایت لے کے اس کے دربار میں پہنچے اور عرض کیا کہ ہم شیعہ کے قریب ہو کر بیٹھے ہیں مگر اس پر بھی یہ آفت ہر کہ بدی عرب ہمیں لوٹا کرتے ہیں۔ اور حجاج نے یہ ظلم کیا کہ خراج کی مقدار ناقابل برداشت کر دی۔ عمر بن عبدالعزیز نے حکم دیا کہ ان لوگوں کی مردم شماری کی جائے۔ گئے گئے تو پہلے کی نسبت اب ان کی تعداد صرف دسواں حصہ رہ گئی تھی۔ یہ معلوم ہو گیا تو اس نے کہا کہ میں اس خراج کو جو یہ سمجھتا ہوں۔ ان کی زمین پر کوئی محصول نہیں ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو کافر مسلمان ہو جائے یا مر جائے اس پر سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ لہذا اس نے تخفیف کر کے صرف دو سو حُلُون کا خراج ان کے ذمے باقی رکھا۔



اقیشتر ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔ غالباً عہد جاہلیت میں پیدا ہوا اور آغاز اسلام میں اس کا نشو و نما ہوا۔ اس کا اصلی نام مغیرہ بن عبد اللہ تھا۔ اور کنیت (ابو معرض) تھی۔ اقیشر اقشتر کی تصغیر ہے جس کے معنی سرخ کے ہیں۔ اس کا بھرہ سرخی مائل تھا۔ لہذا لقب اقیشر مشہور ہو گیا جس سے وہ بلا اتنا اور اگر کوئی اقیشر کہہ کے پکارتا تو بہت ناراض ہوتا۔

اقیشتر نے ایک طولانی عمر پائی اور بنی اسد میں بہت اچھا نسب رکھتا تھا۔ سماک بن مخزوم اسدی نے کوفہ میں مسجد سماک کو حضرت عمر فاروق کے عہد میں تعمیر کیا۔ سماک شیعیان عثمان میں تھا۔ اور اُس محلے والے اب تک اسی گروہ میں چلے آتے ہیں۔ اہل کوفہ کا بیان تھا کہ حضرت علی نے اُس مسجد میں کبھی نماز نہیں پڑھی۔ اور کوفہ والے اب بھی اس مسجد میں جانے سے احتراز کرتے ہیں۔ اقیشر اسی سماک کا رشتہ دار تھا۔ اور اس نے اس مسجد کے متعلق کچھ اشعار کہے تھے۔ یہ مسجد سماک کو بنے میں بنی اسد کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ اقیشر نے اُس مسجد کے متعلق جو اشعار کہے تھے ان کا مطلب یہ تھا کہ بنی دودان ہماری مسجد سے ناراض ہیں۔ اور انھیں اس پر غصہ آتا ہے حالانکہ یہی مسجد ان کی شہرت کا ذریعہ ہے۔ اگر کل ہم اُسے دُعا دیں تو ان کا نام ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔ اُن کا نام اُسی سے ہے اور وہ اس کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ اس کا نام ہمیشہ بنی اسد سے وابستہ رہے گا بنی دودان جب اس میں نماز پڑھیں

تو آدھا ثواب ہم بٹالین گے اس لیے کہ فی مصلیٰ آدھا اجر مسجد کے حصے کا ہے۔ یہ اشعار سننے ہی بنی دودان قسم کھا گئے کہ ہم اسے بغیر مارے نہ رہیں گے۔ یہ سن کر اقیشر ان کے پاس گیا اور کہا میں نے ایک شعر ایسا کہہ دیا ہے کہ اس کی ساری خرابیاں مٹا دی ہیں۔ اور اب تمہیں ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں انھوں نے کہا بکھت تو نے کیا کہا ہے سنا۔ آپ نے ایک شعر پڑھا جس کا مضمون یہ تھا کہ بنی دودان سرداروں کا قبیلہ ہے اور شرافت و کثرت تعداد ان کا حصہ ہے۔ یہ سن کے وہ لوگ خوش ہو گئے اور اپنے ارادہ سے باز آئے۔

اقیشر کو نے کارہننے والا تھا۔ مگر ساری عمر اپنی برادری سے الگ بے عزت اور دائم الجھڑا۔ چنانچہ خود اپنی تعریف میں کہتا ہے کہ ابو معرض بہترین تیرا پتا ہے اور اس کے پیچھے کے بعد عقلمند خطیب بن جاتا ہے لیکن اگر نشے نے کمی کی تو پھر بغیر یہ نہیں رہا جاتا۔ ابو معرض حرام کو حلال کر لیتا ہے۔ اور قبیلہ کی برادری سے باہر ہے۔ وہ بڑوں کی تعریف کرتا ہے اچھوں کی خدمت کیا کرتا ہے اور چاہے وہ لوگ اسے درگزر کر دیں۔ مگر ابو معرض کبھی درگزر نہیں کر سکتا۔ ایک دن اقیشر مقام دیر جیرہ میں سے گزر رہا تھا۔ راستے میں ایک مقام تھا جہاں قبیلہ بنی عبس کے لوگ بیٹھ کے آپس میں باتیں کیا کرتے تھے۔ گویا وہ ان کا کلب تھا۔ ندیمان صحبت میں سے ایک نے چھڑنے کے لیے اس کا نام لے کے پکارا مشہور تھا کہ جب کوئی شخص اس کا نام لے کے پکارتا ہے تو اسے غصہ آ جاتا ہے۔ معزین قبیلہ میں سے بعض لوگوں نے اسے پکارنے والے کو منع کیا اور جھڑک دیا۔ مگر اقیشر بغیر جواب دیے آگے بڑھا چلا گیا۔ پھر ایک شخص کو ساتھ لیا۔ اس کو سکھا دیا کہ تم میرے ساتھ رہو۔ جب میں کوئی شعر پڑھوں تو تم اس کے بعد سوال کر دیا کرو کہ کون ہا اس کے معادضے میں تمہیں دودرہم دون گا۔ اس شخص کو ساتھ لے کے اسی بیٹھکے کی جانب واپس آیا۔ پاس کھڑے ہو کے ایک ایک کو بڑے غور سے دیکھا اور اس نوجوان کو پہچان یا جس نے اسے پکارتا تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہو کے ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ کہ تو مجھے اقیشر کہہ کے پکارتا ہے۔ یہ تو میرا نام ہی ہے۔ مگر میں تجھے چراغ بجھانوا

کا بیٹا کہہ کے پکاروں گا ساتھ والے شخص نے حسب قرار داد پوچھا کون؟ اس کے جواب میں ایک اور شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ رات کے وقت اپنے یار کو چپکے سے بلاتی ہو اور کوئی نہیں جانتا کہ کیوں بلاتی ہے۔ بیشتر اس قدر مشہور ہوئے کہ اسی دن سے اس نوجوان کا لقب "ابن مطفیۃ السراج" یعنی "چراغ بجھانے والی کا بیٹا" ہو گیا۔

ابوالمضار نام ایک شخص تھا جو خیرون کو کرایہ پر چلا تا تھا۔ اقبشر کا معمول تھا کہ اس کا خیر کو کرایہ کے حقہ کے سے فروشوں کے پاس جا کر تا۔ یونین ایک دن ابوالمضار کے پاس آیا کہ اُسے خیر کو کرایہ کرے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں ایک متمبی شخص مٹھا ہوا تھا اقبشر کے جانے بعد اس نے پوچھا کہ یہ کون ہے ابوالمضار نے کہا اقبشر اس متمبی نے یہ سنتے ہی ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس نے ایک ترازو پر بھی ایسی کو اٹھا لیا اور ایک پڑے پر ایک شعر لکھ دیا۔ جس میں اقبشر اور اسکے قبیلہ کی مذمت تھی اور کہا جب اقبشر نے اس شعر کو دیکھا تو بھڑک کر چلا آیا۔ ابوالمضار نے کہا بلے پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو زرا پڑھ لیجئے۔ اقبشر نے اس شعر کے نیچے اپنے دو شعر اس متمبی شخص کی خوجہ میں لکھ دیے۔ اس کے بعد جب متمبی آیا تو اس کو وہ شعر دکھائے گئے۔ اس نے ان دونوں شعروں کے نیچے ایک اپنا شعر اور لکھ دیا۔ اور پہلے سے زیادہ ہجو کی۔ ابکی جو اقبشر نے پڑھا تو کہا کہ یہ یوں نہ ائے گا۔ اور چھ سات شعروں میں ایسے فحش طریقے سے اس کی مذمت کی اور ایسی خبر لی کہ وہ پڑھ کے بیتاب ہو گیا۔ کچھ جواب تو بن نہ پڑا مگر اپنی قوم والوں میں دوڑا گیا اور بہت سے متمبیوں کو ساتھ لے کے پوچھا کہ اقبشر کی خوب مرمت کرے۔ لیکن اور بہت سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بیچ میں پڑ کے صلح کرادی۔

عبد الملک بن مروان کے سامنے اقبشر کے بعض اشعار گائے گئے جو زکریا ابن طلحہ کی مدح میں تھے۔ عبد الملک اُنھیں سنتے ہی بیتاب ہو گیا۔ کینز سے پوچھا یہ اشعار کس کے ہیں۔ ابوالمضار نے کہا جو مدح بغیر لائق کے کجائے ایسی ہی موثر ہوتی ہے۔ یہ بالکل مطابق واقعہ ہے۔ مرموز فرق نہیں اور اس وقت سب سے بڑا شاعر اقبشر ہے۔

ایک سفر میں اقبشر اور کینت بن زیاد کا ساتھ ہوا۔ کینت نے پوچھا ابوالمضار (اقبشر کی کینت) کہاں کا ارادہ ہے۔ اقبشر نے نظم میں جواب دیا۔ ان اشعار کو سن کے

کمیت کا یہ حال ہوا کہ بار بار پڑھتا اور خود پڑھتا تھا اگرچی نہ بھرتا تھا۔ آخر میں کہنے لگا کہ جس کسی نے تمہیں سب سے بڑا شاعر بنایا وہ جھوٹا نہیں ہے۔

نریا دے صفری کی بیٹی مرگئی جنازے کی مشابہت میں اور دن کے ساتھ اقیشر بھی گیا۔ اسے دفن کر کے واپس آ رہا تھا کہ عابس نام ایک غلام ملا۔ اُس نے پوچھا کچھ کھانے پینے کا بھی جی چاہتا ہے۔ کہا بیشک عابس ان کو اپنے گھر لے گیا۔ کھلا اور شراب پلائی جب ذرا سرور ہوا تو آپ نے برجستہ دوش پڑھے جن کا مطلب یہ تھا کہ خدا کرے زیادتی بیہیمان روز مرا کرین اور عابس یونہی روز دعوت کیا کرے یا س کے بعد امیداوار آرزو کی تصویر آج ہی نظر آئی۔

ایک دن حیرہ کے ایک سے فروش کے ہاں اقیشر نے خوب پی۔ مگر پی ہی رہے تھے کہ محتجب آدمی آہوئے۔ اقیشر بھاگ کے گھر کے اندر گھس گیا۔ اور دروازہ بند کر کے چلا یا کہ میں تو شراب نہیں پی رہا تھا۔ مجھے پکڑنے کی کیا وجہ ہے۔ اٹھون نے کہا ہم نے تمہیں جام ہاتھ میں دیے اور اس کو منہ سے لگا کے پیتے دیکھا ہے۔ کہا تم نے دیکھا تو ضرور مگر میں تو اس گھروالے کی اونٹنی کا دودھ پی رہا تھا۔ اٹھون نے کہا ہم ہرگز نہ مانیں گے۔ آخر یہ ہزار خرابی دودھ میں لے کے ملے۔ آپ نے برجستہ تین شعر کہے جن کا اصل یہ تھا کہ ہمارے پینے کا دودھ بوتل میں بھرا ہوا ہے اور اس میں پانی کی آبروش کر دیجیے تو اور اچھا ہو جاتا ہے۔ یہ زعفرانی دودھ ہے جس کی رنگت خوب صاف ہے۔ سخت گمانہ کے بواسیر کا علاج ہے۔ ہم تو اپنا روپیہ صرف کر کے پیتے ہیں محتجب کا دیوانہ سے کہو کہ یہ کیا اندھیر مچا رکھا ہے۔

ایک مرتبہ قبیلہ بنی اسد کے چند کلا عبد الملک بن مروان کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اس نے پوچھا بتاؤ تمہارا شاعر کون ہے۔ اٹھون نے کہا میں بہت سے شاعر ہیں مگر لوگ یہ پسند نہیں کرتے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دین عبد الملک نے کہا اچھا بتاؤ اقیشر کیسا ہے؟ جواب دیا وہ تو مر گیا۔ عبد الملک نے کہا نہیں وہ تو آج تک اپنی عشق بازیوں میں مصروف ہے اُس کے بعد اگر تم میں کوئی شاعر کیسے گا تو اپنی اوقات ضائع کرے گا۔ یہ کہہ کے عبد الملک نے اقیشر کے تین شعر پڑھے اور کہا دیکھو شعرا سے کہتے ہیں۔ اقیشر کے پڑوس میں ایک آٹے والا رہتا تھا جو لین دین کرتا تھا ابو عاشر

اس کی کنیت تھی آقیش نے اس کے پاس جا کے کچھ مانگا۔ اس نے ونے سے انکار کیا۔ آپ نے آتے ہی اس کی جوہن دوشتر کہہ ڈالنے جن کو سنتے ہی وہ گھبرا کے دوڑ آیا۔ جو کچھ اُنھوں نے مانگا تھا پیش کر دیا اور کہا اللہ اب ان شہوں کے بعد اور کوئی شہر آپ نہ فرمائے گا۔

ایک اعرابی جو بنی تمیم بن سے تھا اکثر آقیش کے ساتھ سفر کیا کرتا تھا اُس نے ان کی مخالفت میں چند شعر بھی کہے۔ اُن کے اُنھوں نے پوچھا تو کس قبیلے میں سے ہو اُس نے بتایا کہ میں بنی تمیم میں ہوں۔ آقیش نے فوراً اسی قافیہ میں اُس کی جوہن جس کا اثر یہ ہوا کہ معززین بنی تمیم ان کے پاس دوڑے آئے۔ معذرت خواہ ہوئے اور ان زبان درازیوں سے اُنھیں روکا۔

ایک مرتبہ آقیش نے حیرہ کے ایک مقام میں شراب پی۔ وہاں ایک درزی بیٹھ کے سیا کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک اندھا بیٹھا ہوا تھا اور ایک مغنی کچھ گارہا تھا آقیش اس کے نغمے سے اس قدر خوش ہوا کہ اپنے پاس سے اُسے شراب پلائی۔ جب سب کا نشہ زور وں پر ہوا تو اندھا اُٹھ کے دوڑنے لگا۔ اور درزی بیٹھے بیٹھے ناچنے لگا۔ آقیش نے برجستہ چند ایسے اشعار کہے جو نہایت ہی لطیف تھے اور چند ہی روز میں ہر جگہ مشہور ہو گئے۔

آقیش کے بہان ہمیشہ شراب کا دور چلتا رہتا۔ اور ندیان محبت جمع ہوتے۔ حجاج نے سنا تو اس محبت کے بعض لوگوں کو پکڑ بلا یا صحبت درہم و برہم ہو گئی بعض بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعض مر گئے۔ اور بعضوں نے توبہ کر لی۔ اس واقعہ کو بھی آقیش نے اپنی ایک نظم میں نہایت لطف سے ظاہر کیا ہے۔

آقیش کا معمول تھا کہ پانچ درہم سے زیادہ کسی سے نہ مانگتا۔ ان میں سے دو درہم خیر کے کرائے میں صرف ہوتے۔ دو دین شراب اڑتی۔ اور ایک سے کھانا چلتا اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ آقیش کے پڑوس میں ابوالمضار نام ایک شخص رہتا تھا۔ جس کے خیر کرایہ پر چلتے تھے۔ آقیش دو درہم دے کے اس سے خیر لیتا۔ سوار ہو کے حیرہ میں پہنچتا۔ کھوار کے گھر میں پہنچ کے خیر کو کسی درخت میں باندھ دیتا۔ اور بیٹھ کے پیتے پیتے شام کو دیتا۔ شام کو اسی خیر پر سوار ہو کے گھر واپس آتا۔ لوگوں میں مشہور

تھا کہ آتش نے اس خچر کا اتنا کرایہ دیا کہ اس کی قیمت سے زیادہ ادا کر دیا۔ اس خچر کی طرف
مخاطب ہو گئے اُس نے ایک نظم بھی کہی ہے جس میں اپنی سیکشی کی شان دکھائی ہے۔
معمول کے مطابق ایک دن چہرہ بین کلوار کے گھر پہنچا تو اس کا پتہ نہ تھا۔
بیٹھ کے انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں بنی عباد کی ایک عورت اس مکان میں آئی آتش نے
نے پوچھا ہے فروش کہاں گیا۔ وہ بولی کسی کام کو گیا ہے۔ میں اس کی بوی ہوں
تم کیا چاہتے ہو۔ کہا بنید (ایک قسم کی شراب) چاہیے۔ اس نے پوچھا کہ کتنے کی کہا
دو درہم کی۔ وہ بولی لاؤ۔ درہم لاؤ۔ میں لائے دیتی ہوں۔ اُنھوں نے درہم
دیدے۔ گروہ بنید لینے چلی تو احتیاط کے لیے خود بھی اُس کے پیچھے ہو گئے۔
آخر جاتے جاتے وہ ایسے مکان میں داخل ہوئی جس کے دو دروازے تھے
یہ اس مکان میں ایک جگہ بیٹھ رہ گئے۔ اور وہ دوسرے دروازے سے نکل کے
غائب ہو گئی۔ اُنھیں جب بیٹھے بیٹھے دیر ہوئی تو اس گھر والوں میں سے ایک
شخص قریب آیا اور پوچھا کیوں بیٹھے ہو۔ اُنھوں نے ساری سرگزشت بیان کی
اُس نے سن کے بٹا افسوس کیا اور کہا وہ تم کو دھوکا دے کے دوسرے دروازے
سے نکل گئی۔ یہ آم خین نام ایک بڑی مکار عورت ہے جو بنی عباد میں سے ہے۔
اب آپ سمجھ کہ میں قریب میں آ گیا۔ اس مکان سے نکل کے کلوار کے پاس آئے
اس سے واقعہ بیان کیا اور کہا کہ اب آج تو مفت پلو کے مزا کرادو۔ کل دام
دس دیدون گا۔ اس نے بقدر ضرورت بنید پلا دی اور اُنھوں نے اپنے
دو درہم کی مائتم میں ایک نظم کہ ڈالی بعض راوی بیان کرتے ہیں کہ اس
کلوار کا نام خین تھا۔ اور اسی رعایت سے اُس مکار عورت نے اپنا نام خین
بتا دیا۔ اس نظم میں اُنھوں نے آم خین کا نام لے کے برا بھلا کہا تھا۔ لہذا جب خین
کلوار کے پاس پھرا آئے تو اُس نے کہا کہ میرا کیا قصور تھا جو آپ نے میری اور
میری ماں کی جھوٹے ڈالی۔ آپ نے کہا کہ اُس مکار عورت نے مجھ سے دو درہم
لے لیے اور شراب نہ دی۔ اس نے کہا خدا کی قسم میری ماں آپ کو پہچانتی بھی
نہیں اور نہ اس نے کچھ آپ سے لیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ماں کو بلالایا
اور کہا دیکھ ان کو آپ نے درہم دیے ہیں یا کسی اور کو۔ آپ نے دیکھ کے

کہا میں انھیں کیا جانوں۔ میں نے تو آم جنین کو درہم دیے ہیں۔ اسے اور اُس کے بیٹے کو
گایان دیتا ہوں۔ ام جنین اگر کوئی اور عورت ہے تو میری مراد اُس سے ہے۔ اور اگر
تھاری مان ہے تو وہی سہی۔ میں اسکا کیا کروں۔ اس نے کہا یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا
کہ جس نے آپ کو دھوکا دیا وہ میری مان نہ تھی۔ مگر اس بھوکا اثر تو مجھ پر اور ان پر
پڑتا ہے۔ جواب دیا تو کیا تم جانتے ہو کہ میرے یہ دو درہم یونین جاتے رہیں گے؟ اُس
نے پریشان ہو کے کہا خدا تمھیں غارت کرے لو اپنے دو درہم مجھ سے لے لو اور
بھی جو کچھ کو پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر میری جان جھوڑ دو۔

عربان بن ہشتم نخعی اقیشر کا دوست تھا۔ اس نے کہا اقیشر میں شام کے ملک میں
جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے چند پُر لطف اشعار لکھو دو۔ انھوں نے لکھو دیے۔ وہ شام
گیا بہت سی دولت چل کی اور ایک غلام کے ہاتھ پچاس درہم ان کے پاس بھجوائے
غلام نے آ کے درہم اُنھیں دکھائے۔ اور کہا یہ پچاس درہم دیتا تو ہوں مگر اس شرط
سے کہ آپ قرآن کی ہجو کہہ دیجیے۔ اس لیے کہ حساب سے جتنا آپ کو ملنا چاہیے
اتنا اُس نے نہیں دیا ہے۔ آپ نے بے تکلف عربان کی ہجو میں تین شعر اسی وقت
کہہ دیے اور درہم لے لیے۔ اتفاق سے عربان کا باب ہشتم کو نے کاگو تو ال تھا
پہلے آپ کو اس کا خیال نہ آیا تھا۔ اب ان اشعار کا غلغلہ ہوا تو آپ ڈرے کر دیکھے
کیا کرتا ہوں۔ مگر ہشتم نے جب وہ اشعار سنے تو پانسو درہم ان کے پاس اور بھیج
دیے اور درخواست کی کہ اللہ میرے بیٹے کی جان جھوڑے اور اب اُس کی
ہجو نہ کہیے گا۔

حضرت کے ایک شخص نے جو کہنے میں رہتا تھا نبی اسد کی ایک عورت
آنکاح کا پیام دیا اور ادھر ادھر لوگوں سے اس عورت کا حسب نسب دریافت کرنے
لگا۔ اقیشر کے پاس بھی آیا اور اُس عورت کی کیفیت پوچھی کیونکہ یہ بھی نبی اسد میں
سے تھی۔ انھوں نے پوچھا تم کون ہو۔ اُس نے کہا میں حضرت موت کا رہنے والا ہوں۔
یہ سنتے ہی آپ نے دو شعر کہے جن کا مضمون یہ تھا کہ اہل حضرت موت ہمارا نسب
دریافت کرتے ہیں حالانکہ ہمارا ہی نسب حضرت موتیوں کے لیے مایہ ناز ہے۔ بندوں
کے بھائی جن کے تمام بند رچا ہیں۔ سب اہل عرب خدا سے یہی دعا مانگتے ہیں کہ

تھامی قرابت سے بری رہیں۔

اقیشر سے ایک دن ان کی چھو بھی نے کہا کہ خدا سے ڈر وادراٹھ کے ناز پڑھو۔ کہا ناز تو نہ پڑھوں گا۔ اس نے بار بار تاکید کی کہ نہیں پڑھنا ہوگی کہا تو اچھا دو باتوں میں سے ایک اختیار کر لو۔ یا تو ناز پڑھوں گا اور طہارت نہ کروں گا۔ اور یا طہارت کروں گا تو ناز نہ پڑھوں گا۔ ان کی چھو بھی نے کہا کہ یہ شرطیں لازمی ہیں تو بے وضو ہی پڑھو۔ مگر پڑھو ضرور۔

ایک دن قہرہ والے سے فروش کے گھر میں آپ پی رہے تھے۔ ناگمان محبت کا ایک آدمی آگیا۔ آپ گھر کے مکان کے اندر گھس گئے۔ اور دروازہ بند کر لیا۔ اس نے چلا کے کہا اچھا تم شوق سے پیو۔ مگر بنید کا ایک جام مجھے بھی پلوا دو۔ آپ نے کہا مجھے بخدا تمھارا اعتبار نہیں۔ لیکن اس دروازے میں سوراخ موجود ہے۔ نیچے بیٹھ جاؤ میں بین سے پلائے دیتا ہوں۔ وہ بیٹھ گیا اور آپ نے نہ کل کی ایک چوٹکی میں سے اُسے بنید پلائی بیان تک وہ پیتے پیتے مدہوش ہو گیا۔ اس واقعے کو بھی آپ نے نظم کیا ہے۔

اقیشر نے ایک دن محمد بن اشعث کے بیٹے قیس کے پاس جا کے جو ابنا لٹھا کچھ مانگا۔ اُس نے اپنے داروغہ کو حکم دیا کہ انھیں تین سو درہم دید و۔ آپ نے کہا مجھے اکٹھا نہ دیجئے۔ داروغہ صاحب سے کہہ دیجئے کہ مجھے تین درہم روزانہ دید یا کریں۔ اُس نے یہی حکم دید یا۔ اس کے بعد آپ روز داروغہ کے پاس جاتے اور تین درہم لے آتے جن میں سے ایک نرل پینے میں ایک کھانے میں اور ایک کرایہ میں صرف ہوتا۔ جب یہ رقم پوری صرف ہو گئی تو آپ نے پھر اُس سے سوال کیا۔ اُس نے پھر تین سو درہم اسی مد میں دلوا دیے۔ وہ رقم بھی صرف ہو گئی تو تیسری بار گئے اس نے پھر وہی رقم دیدی اور پھر صرف ہو گئی۔ چوتھی بار پہنچے اور سوال کیا۔ اس نے بگڑ کے کہا تم نے یہ اپنا خرچ مقرر کر لیا ہے؟ جاؤ اب میں کچھ نہیں دیتا۔ آپ جوش میں بھرے ہوئے واپس چلے اور اُس کی جھک کہ ڈالی۔ وہ اشعار جب قیس تک پہنچے تو اُس نے کہا اقیشر کی زبان سے دنیا میں کوئی اور بجا ہوتا تو میں بھی بیخ جاتا۔

کوفہ کے بعض لوگوں میں ایک دن ابو بکر بن عمر بن عبد اللہ بن عثمان و قلی بن کے بارے میں نزاع ہوئی اور جھگڑا کسی طرح نہ ہوا تھا۔ آخر سب نے اس پر اتفاق

کیا کہ اس وقت جو کوئی پہلے سامنے آ جائے اسی کو حکم قرار دین اور وہ جو فیصلہ کرے اُسے مان لیں۔ اگہان سامنے سے میان آقیش صاحب دکھائی دیے جو نشے میں جھومتے چلے آتے تھے۔ ان کی صورت دیکھتے ہی سب نے کہا دیکھیے حکم کیسا معقول ملا ہے۔ مگر چونکہ اسی پر فیصلہ ہو چکا تھا سب نے بڑھ کے کہا ابو معرض ہم نے آپ کو حکم قرار دیا ہے۔ پوچھا کس بارے میں؟ لوگوں نے واقعہ بیان کیا۔ آپ ذرا رُک کے اور اس کے بعد ہی سر اٹھا کے تین شعر پڑھے جن کا مطلب یہ تھا کہ جب میں ہر روز رن پانچ نمازین پڑھ لیتا ہوں تو خدا میرے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ میں پروردگار عالم کا شریک کسی کو نہیں بتاتا اور میں ایک ایسے حق کو پکڑے ہوں جس میں کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ راستے میں جو عمارتیں ملتی ہیں اگر میں انھیں نہ دیکھوں تو مجھے معاف کر دو۔ آقیش نے اپنے چچا کی بیٹی تر باب کے ساتھ چار ہزار یا بقول بعض دس ہزار درہم مہر پر نکاح کیا اور مہر کی رقم مانگنے کے لیے اپنے قبیلے والوں کے پاس آئے۔ مگر کسی نے کچھ نہ دیا تب ابن اس لبعل کے پاس گئے جو ملک چین کا ایک زمیندار اور مجوسی تھا۔ اس کا تھا۔ اُس نے مہر کی پوری رقم دیدی۔ آپ نے خوش ہو کے چند شعر کہے جن کا مضمون یہ تھا۔ تر باب کا مہر ایک مجوسی نے ادا کیا اور اس پر مامون اور چچا سب قربان ہیں۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ تو بڑا خوش اخلاق ہے۔ اور تیرا باپ کریم اور فیاض تھا۔ اور اس کا بھی مجھے اقرار ہے کہ تو سارے اہل دوزخ کا سردار ہے۔ قارون کے گڑھے میں تو اُس کا بڑوسی ہوا اور فرعون کا تیرا ساتھ ہو۔ مجوسی زمیندار نے جب یہ اشعار سنے تو بہت بگڑا اور کہا کم نجت تو اپنے قبیلہ میں گیا۔ وہ ان کسی نے تجھ کو کچھ نہ دیا۔ تب میرے پاس آیا۔ میں نے جس قدر رقم کی ضرورت تھی سب دیدی تو اس کا بدلہ بھی ہے کہ تیرے شعر اور تیری خاشاک سے میں بھی نہ بچ سکا۔ جواب دیا کیا تم اس سے خوش نہیں ہوئے کہ میں نے تمھیں ابو جہل سے بھی بڑھا کے بادشاہوں کے برابر بٹھا دیا۔

ایک دن آقیش نے ایک کلوار کے پاس بیٹھ کے شراب پینا شروع کی۔ بیان تک کہ ایک پیسہ بھی باقی نہ رہا تب آپ نے اپنے کپڑے اتار کے سب کلوار کے حوالے کر دیے اور اُن کی قیمت کی بھی پی گئے۔ پھر رہنمائی چھانے کے لیے بھوسے کے ایک انار میں گھس کے بیٹھ رہے۔ سر اوپر نکلتا تھا اور باقی سارا جسم اس کے اندر تھا۔

اتنے میں ایک شخص اپنی کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈھتا آیا۔ آپ نے بے اختیار دعا مانگنا شروع کی یا اللہ ہمیں بچاؤ۔ اور اس شخص کا جو کچھ کھو گیا ہوا مل جائے یہ دعا سن کے کلوار نے بھجھلا کے کہا تمہارے پاس اب رہا ہی کیا ہے جس کو اللہ بچائے گا۔ بولے یہ بھوسہ نہیں ہے۔ اگر اسے کوئی لے لے تو سردی سے اکر دے کر مر جاؤں گا۔ اس پر سرفروش کو ہنسی آگئی۔ کپڑے ان کے حوالے کر دیے اور کہا بس اب تشریف لے جائیے جب پینہ پاس ہو تو آئیے گا شراب کی قیمت میں آپ کے کپڑے میں پھر کبھی نہ لون گا۔

ایک دن آپ نشے میں بدست جا رہے تھے رستے میں ہتیشم نام ایک شخص ملا جو کوئی توالی کے عمدہ پر امور تھا۔ اس نے اپنے سامنے بلایا اور کہا تم نشے میں ہو۔ کہا جی نہیں تو اس نے کہا اور یہ موندہ سے بولکیسی آرہی ہے کہا میں نے سیب کھا یا تھا اس کی بولہ۔ اس جواب پر وہ ہنس پڑا اور کہا اچھا نشے میں نہیں ہو تو بتاؤں میں کے رکعتیں پڑھتے ہو۔ آپ نے برجستہ سات شعر پڑھے جن میں عجب لطف اور بے ترتیبی اور غلطی کے ساتھ دن بھر کی نازین اور رکعتیں بتائیں یہ سن کے ہتیشم نے کہا جی ہاں آپ نے نازین بتا دیں۔ امتحان میں کامیاب ہوئے اور ٹھنڈے ٹھنڈے تشریف لے جائیے۔

ایک مرتبہ اقیشر خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دربار میں پہونچ گئے۔ اس نے کہا شراب کے بارے میں اپنے کچھ اشعار سناؤ۔ آپ نے سنا لئے۔ عبدالملک نے داد دی اور کہا آج معرض خوب کہا ہے اور شراب کی ایسی اچھی تعریف کی ہے کہ مجھے معلوم ہوتا ہے تم نے پی ضرور ہے۔ کہنے لگا اور امیر المومنین آپ کے اس بیان جانے سے بہ خدا مجھے آپ پر بھی ہی شبہ ہوتا ہے۔

اقیشر کا معمول تھا کہ اپنے بعض دو ٹمند بھائیوں کے پاس جا کے مانگ لایا کرتے۔ اسی معمول کے مطابق ایک شخص کے پاس گئے۔ اس نے بالسنو درجم دیے۔ اُنھیں لے کے سیدھے شراب خانے میں پہونچے اور وہ رقم سے فروش کے پاس رکھوا کے کہا لو اسے میرے حساب میں جمع کر لو۔ اسی میں سے روز مجھے جتنی شراب مانگوں دے دیا کرو۔ اب آپ کے کئی دوست

پیدا ہو گئے جن کو آپ روز پلو اتے اور خود بھی پیا کرتے۔ وہ رقم ختم ہو گئی۔ اس کے بعد دو دن تو یہ ہوا کہ اُن دوستوں نے اپنے پاس سے انھیں پلوادی۔ مگر تیس دن جو انھیں دور سے آتے دیکھا تو اُن دوستوں نے بے فروش سے کہا کہ ہم جاتے ہیں تمھارے کوٹھے پر بیٹھیں گے! قیشر ہمیں پوچھے تو کہہ دینا وہ آج نہیں آئے۔ چنانچہ جیسے ہی افیشروان ہوئے اس نے کہا آج تمھارے دوست نہیں ہیں۔ اپنے یہ دیکھ کے کہ کوئی پلوانے والا نہیں ہے اپنے کپڑے اتار کے اس کے سامنے ڈال دیے اور کہا لو انھیں رکھو اور جتنی مانگوں پلو دو۔ اس نے شراب دیدی اور آپ بیٹھ کے پینے لگے۔ آپ نے دوستوں کو کوٹھے پر جاتے دیکھ لیا تھا۔ جب افیشر کا نشہ تیز ہوا تو آپ نے تین شرپڑے جن کا مضمون یہ تھا کہ دوستو جام پر جام پلو بیان تک کہ میں مدہوش ہو کے گر پڑوں اس لیے کہ میرے سر پر کوٹھے کے کمرے میں ایسے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں جو آدمیوں کو فریب دیتے ہیں۔ وہ ان بیٹھے خالص شراب تندہ پیتے ہیں۔ تکرکاری سے سر نہیں اٹھاتے۔ یہ شر جو اُن دوستوں کے کان میں پہنچے تو وہ بے اختیار ان کی خوشامد کرنے لگے اور وہیں سے چلا کے کہا آؤ افیشر آؤ۔ اوپر چڑھ آؤ یا کو تو ہم نیچے اُتر آئیں۔ یہ سن کے افیشر اوپر چڑھ گئے۔ اور اُن کی صحبت میں بیٹھ کے پینے چلائے گئے۔

افیشر نے ایک مرتبہ بشر بن مردان کی تعریف میں قصیدہ کہا اور اس کے پاس جا کے سنایا۔ اُس وقت وہاں امین بن خزیمہ اسدی بیٹھا ہوا تھا۔ بولا کلام تو بخدا بہت اچھا ہے مگر جس سینے سے نکلا ہے وہ مایاک ہے۔ اس کے جواب میں افیشر نے ایک شعر پڑھا اور اپنے گھر واپس چلا آیا۔ پھر اپنے چچا کو بشر کے پاس بھیجا۔ وہ وہاں سے ایک ہزار درہم لے آیا اور افیشر سے کہا خدا کی قسم یہ رقم میں تمھارے ہاتھ میں نہ دوں گا۔ تم شراب و کباب میں اُترا دو گے۔ پوچھا کہ پھر آپ کیا کیجے گا۔ کہا تمھارے اور تمھارے بال بچوں کے کپڑے بنا دوں گا اور تمھارے لیے سال بھر کی غذا فراہم کر دوں گا۔ یہ سن کے افیشر خاموش ہو رہا۔ مگر دوسرے دن خود بشر کے پاس پہنچے اور ایک شرپڑے حاجس کا مطلب یہ تھا کہ ابو مردان (یہ بشر کی کنیت تھی) کو خبر کر دو کہ اُن کے دیے ہوئے انعام کو وہ شخص لے گیا جو میرے اہل و عیال میں نہیں داخل ہے۔ اس نے واقعہ پوچھا تو سارا

ماجرایان کر دیا۔ بشر نے فوراً کو تو ال کو بھیج کے ان کے چچا کو بکڑ بلایا۔ اُن سے وہ ہزار درہم چھین کے اقیشر کے حوالے کر دیے اور کہا تو یہ خاص تمھارے لیے ہیں اور تمھارے بال بچوں کی خبر گیری کے ہم جدا گانہ مشکفل ہیں۔

ایک مرتبہ اقیشر حیرہ کی ایک کھوارن کے پاس پہنچے جس کا نام دومہ تھا۔ اس کے پاس جا کے بیٹھے اس سے بنڈ خرید کے پی اور اس کے بعد کہنے لگے کہ اچھی بلواؤ کہ تمھاری تعریف بھی ویسی ہی اچھی کر دے۔ اس نے منتخب شراب لاکے پیش کر دی۔ اُنھوں نے پی۔ بہت خوش ہوئے اور اس کی تعریف میں تین شعر کہ دیے جن کا مضمون یہ تھا کہ دومہ تیرا شراب خانہ آباد ہے بیمار و ناتوان بھی آتا ہے تو تو اُسے اپنی شراب پلا کے تازہ دم کرتی اور اس کے پیٹ میں شیطان رحیم کو بھونک دیتی ہے۔ دومہ اس پر بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی نہ تو اس سے اچھی میری کوئی تعریف ہو سکتی ہے اور نہ اس سے زیادہ میں کسی تعریف پر خوش ہو سکتی ہوں۔ مطرف نام ایک بھی شخص والی کو مذموم قرار دیا۔ جب وہ تقریر کرنے کے لیے منبر پر چڑھا تو اس کے چڑھتے ہی منبر ٹوٹ گیا اور وہ گر پڑا۔ اقیشر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ برجستہ دو شعر پڑھے جن کا مضمون یہ تھا کہ اے بنی تمیم منبر تمھارے لیے نہیں ہے اور اُسے تمھارے نیچے قرار نہیں آتا۔ تمھارے جسم تمام مجبورن کو ناگوار ہیں۔ بنی خزمہ کو بلاؤ کہ منبر کو زینت دیں۔

بنی محارب میں سے ایک شخص جس کا نام قرظہ بن یعقوب تھا اقیشر کے پاس سے ہو کے گذرا۔ اقیشر اس وقت اپنے قبیلے والوں یعنی جوانان بنی اسد میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس شخص کو پہچانتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا اس شخص کا نام کیا ہے؟ آپ نے نظم میں جواب دیا کس میں اتنی طاقت ہے کہ اس کا نام لے اور بڑے بڑے عقلمند اس کا ذکر کرنے سے عاجز ہیں۔ لوگ ہنسے اور کہا ماشاء اللہ نام بتانے میں کون سی دشواری ہے کہا ان کے نام و نسب اتنے بڑے ہیں کہ ایک دن میں ختم ہی نہیں ہو سکتے۔ کہو تو آج نام بتاؤں اور کل نسب بتا دوں گا۔ اُنھوں نے کہا اچھا آج نام بتاؤ۔ اُنھوں نے بتایا قرظہ۔ پاس بیٹھنے والوں میں سے کسی نے کہا قرظہ کا بیٹا؟ اقیشر نے کہا ہاں کتنے ہو لیکن نام کا تلفظ ادا کرنے میں مجھے اتنی

دشواری پیش آئی کہ اسی میں الجھ کے رہ گیا تھا۔ یہ خبر قریظہ کو پہنچی تو اس نے نظم میں جواب دیا اس لیے کہ وہ بھی شاعر تھا۔ اُسکے اشعار کا حاصل یہ تھا کہ تیری نشہ کی زبان پر بہ ہیر گاری کی چیزیں گراں ہوا ہی چاہیں۔ ہاں بدکاری کی باتیں ہوں تو تیری زبان خوب تیز چلتی۔ اقیشر نے اس کے جواب میں اسی جواور قافیہ میں جواشعار کہے ان میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ قریظہ کو خود تو بدکار عورتوں کے گھروں میں جانے شرم نہیں آتی مگر مجھے سبکشی پر شرم دلاتا ہے حالانکہ میں تو جب تک زندہ ہوں پتیارہوں گا۔ اور مر جاؤں گا تو بھی دل میں اس کا لیکا باقی رہے گا۔

ایک مرتبہ حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ اہل شام کے مقابلے کے لیے فوج لے کر روانہ ہوا اور اقیشر کو بھی اپنے ساتھ نہ بدوستی پر کھڑے کیا کہ سفر میں دلچسپی رہے گی۔ آپ کے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا۔ ایک گدھے پر سوار ہو کے چلے۔ یہ لشکر شہر سور کے قریب پل سے پار ہوا تو قریب ہی ایک گاؤں ملا جس کا نام قنین تھا۔ وہاں ساتھوں کی آنکھ بچا کے آپ ایک سے فروش کی دکان میں گھس گئے۔ یہ سے فروش نہٹی تھا خود شراب بیچتا تھا اور اس کی عورت بدکاری کے ذریعے سے روپیہ پیدا کرتی تھی۔ آپ وہیں چھپ رہے جب لشکر روانہ ہو گیا تو گدھا بیچ ڈالا اور میکشی دعیاشی میں مشغول ہو گئے۔ وہ لشکر ہم پوری کر کے واپس آیا تو آپ ایک بہت بڑا قصیدہ پڑھتے ہوئے اس کے سامنے نمودار ہوئے جس میں بیان کے اپنے سارے کازاتے بیان کیے تھے۔

ہارون رشید نے ایک رات کو کسی شخص کے گانے کی آواز سنی جو چار شعر گارہا تھا۔ اُن کا مضمون یہ تھا کہ اگرچہ شراب کم ہو گئی اور منع کر دی گئی ہے اور اسلام اس کے درمیان میں حائل ہو گیا ہے مگر میں روز صبح کو خالص شراب پیتا ہوں اور مرض دل کا اس سے علاج کرتا ہوں کبھی خالص پیتا ہوں۔ کبھی پانی ملا لیتا ہوں۔ اور میرے سامنے کھڑے ہو کے مغنیہ عجب ناز دانداز سے گٹ کر می بھرتی اور آواز کے نشیب و فراز سے مجھے محو کر دیتی ہے۔ ہارون رشید کو یہ اشعار اور اس کی دھن ایسی اچھی معلوم ہوئی کہ لوگوں کو دوڑا کہ اس شخص کو بلا لاؤ۔ لوگ اسے لے آئے مگر وہ سامنے کھڑا رہا دہشت کے کانپ رہا تھا۔ رشید نے کہا ڈرو

نہیں۔ مجھے تمھاری آواز بہت اچھی معلوم ہوئی۔ اس نے کہا خدا کی قسم اگر میں
میں نے ان اشعار کو اس لیے گایا کہ شراب پینے سے توبہ کر لی ہے۔ یہ اشعار آتش
کے ہیں۔ اور اس نے بھی شراب سے توبہ کرتے وقت کہے تھے۔ رشید نے پوچھا
تم نے چھوڑ کیوں دی۔ جواب دیا۔ خدا کے خوف سے اور اس کے بعد
شراب کی خدمت میں چند شعر پڑھے۔ رشید نے کہا مجھے اس سے بحث نہیں
ہے کہ تم شراب پیتے ہو یا چھوڑ دی ہے جو جی چاہے کر دو۔ مگر یہ نغمہ ذرا پھر
سُناؤ۔ اس نے دوبارہ وہ اشعار گائے۔ رشید کو اس قدر بھلے معلوم ہوئے
کہ اپنے مغنیوں کو بلوایا۔ اور ان کے سامنے اُس شخص سے گواہی لے لی کہ اس دھن
کو یاد کر لو۔ اس کے بعد اس شخص کو انعام دے کر رخصت کر دیا۔ مگر یہ دھن
خود رشید کے گلے میں اس قدر اتر گئی تھی کہ چند روز تک معمولی باتیں کرتا۔
تو آواز میں اسی دھن کی جھلک پائی جاتی۔

ریو ریو

خواب و خیال۔ انجمن ترقی اردو کا مستقرب تک ہمارا صوبہ رہا وہ
بالکل گنہگار کی حالت میں رہی اور زبان کی بہت کم خدمت کر سکی۔ مگر جب سے ہمارے
کرم و عظم جناب مولوی عبدالحی صاحب کے ہاتھ میں گئی اور اس کا مرکز اور نگینہ
دکن قرار پایا اس کی ترقی شروع ہوئی اور اس کے ذریعہ سے اردو کا ادبی
خزانہ مفید تصانیف سے مالا مال ہو رہا ہے۔ اردو کی نادر الوجود کتابیں
خواب و خیال ہوئی جاتی ہیں اور ان کا تیرہ بھی نہیں چلتا کہ کیا ہوئیں۔ یہ مثنوی
بھی اسی قسم کی کتابوں میں تھی۔ یہ صرف انجمن ترقی اردو کی کوشش و کاوش
کا نتیجہ ہے کہ دستِ درازانہ سے محفوظ کرنے کے لیے چھاپ کر شائع کر دی گئی ہے۔
یہ مثنوی حضرت خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی خواجہ سید محمد علی
کی تصنیف ہے۔ انجمن ترقی اردو نے بڑا کام کیا کہ اسے اپنے حاکم کے
مطبع میں نہایت صاف اور خوشنما چھاپ کے شائع کر دیا۔
اس مثنوی میں کوئی قصہ نہیں نظم کیا گیا ہے۔ بلکہ جذبات عشق اور

داروات قلبی کو ایسی سیلیس شستہ اور بے تکلف زبان میں ادا کیا ہے کہ کوئی اور
مثنوی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کا ہر شعر جذبات کے اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔
ایک مقام سے چند اشعار بلا کسی خاص انتخاب کے نقل کیے جاتے ہیں جن سے
میراثہ کے کلام کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

یاد ہیں جو کیے تھے قول و سہارا تھیں کیا کھا میں تھیں ہزاروں بار
عہد و پیمان ہوئے مٹھے آپس میں دوستی کی ہوئی تھیں سب راہیں
کہنا تیرا و عہد کر باہم تو بنا ہے گا دیکھیں گے اہم
کس قدر ارتبا ط کرتے تھے گرمی اختلاط کرتے تھے
ایک دم بھی جدا نہ ہوتے تھے ساتھ کھاتے تھے ساتھ سوتے تھے
غیر کو وہاں کہاں گزاریا تھا اور کاموں کا کب گوارا تھا
مثنوی کے شروع میں جناب مولوی عبدالحی صاحب بی اے آنریری سکریٹری
انجمن ترقی اردو کا ایک نہایت قابلانہ مقدمہ پڑھنے کے قابل ہے۔
ہمیں امید ہے کہ لوگ اس کتاب کو ذوق و شوق سے منگوائیں گے۔
لٹنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن قیمت فی جلد مجلد ڈیڑھ روپیہ اور
غیر مجلد ایک روپیہ۔

ستوتی دیناے اردو میں علامہ راشد الجیری سرکون واقف نہیں۔ یہ انجمن کی تصنیف
ہے۔ اور اسی رنگ میں جو ان کے لیے مخصوص ہے۔ قصہ دلچسپ اور موثر
ہے۔ شائقین زبان اردو ضرور منگوائے پڑھیں۔ قیمت فی جلد آٹھ آنہ
لٹنے کا پتہ۔ منیر صاحب رسالہ عصمت۔ دلی۔

سرور عالم مؤلف مولوی سید عبدالمجید صاحب ناظم دارالتصانیف کبوتر تھلہ
یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مختصر سوانحی ہے۔ مؤلف صاحب تحریر
فرماتے ہیں کہ یہ امر اس کتاب کی تالیف کا محرک ہوا کہ مرد و عورت مولودوں میں ایسے
خلاف عقل و قیاس واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن سے شریعت اور سمجھدار

آدمی ایسی محفلوں سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے مولف نے یہ مولود و شریف مرتب فرمایا ہے جس میں نہایت مستند عربی فارسی انگریزی اور اردو کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ اور جناب رسالت آب صلعم کے کل واقعات مختصر طور پر آگئے ہیں۔ اس کتاب میں بلا و عرب کا نقشہ اور کوہ حمر کا فوٹو بھی دیا گیا ہے۔ کاغذ لکھائی اور چھپوائی اچھی قیمت فی جلد بارہ آنہ مصنف صاحب منگوائی جائے۔

خیابان - یہ ماہانہ رسالہ خاص ہمارے شہر سے بڑی خوبی کے ساتھ کلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے ایڈیٹر ہمارے دوست شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم اے ایل ایل بی (علیگ) ہیں

لکھنؤ کسی زمانے میں لیتھو کی لکھائی اور چھپائی کے لیے مشہور تھا۔ مگر اب نہ تو ویسے لکھنے والے رہے ہیں اور نہ چھاپنے والے۔ تاجر ان کفایت شعاری نے سب کو شاد دیا۔ اور ہمیں یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ چاہے ہزار کوشش کی جائے مگر اب لکھنؤ میں کسی کتاب کا اچھا طبع ہو، اخیر ممکن ہو گیا ہے۔ لیکن اس رسالے کو دیکھ کے ہمارا خیال بدل گیا۔ یہ نظامی پریس لکھنؤ میں چھپا ہے۔ کاغذ بھی اسی مناسبت سے اچھا لگا یا گیا ہے۔

ہم اس رسالہ کا بڑے شوق کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ اسکے قلمی معاونین میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی، مولانا صفی صاحب، سید سحر علی رضوی صاحب، ڈاکٹر بیج ہادر سپرو، پنڈت کشن پرشاد کول، مولوی سید جالب صاحب، علامہ عبد اللہ یوسف علی صاحب، اور مسٹر فیروز الدین مراد کے ایسے مشاہیر اہل قلم کے نام ہیں۔ اور ان میں سے اکثر حضرات کے مضامین پہلے اور دوسرے رسالوں میں موجود ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ بہت ترقی کرے گا۔ اردو دان حضرات کا فرض ہے کہ اس کی قدر کریں۔

سائز ۲۶-۲۰ - چند سالانہ پانچ روپیہ - منیجر صاحب خیابان کوٹورہ
ایڈیٹر لکھنؤ کے پتہ سے منگوا یا جائے۔



بلادِ سنس



تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ کے ساحل بالکل غیر محفوظ تھے۔ بحری قزاق اس قدر زیادہ ہو گئے تھے کہ وہ صرف بحری راستوں ہی میں لوٹ مار نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر ساحلی شہروں میں بھی گھس آنے اور لوٹ مار کے چل دیو تھے۔ حال بحری راستوں کا تھا خشکی پر بھی راستوں کا یہی حال تھا کوئی راستہ چوہن اور ڈاکوؤں پر صاف نہ تھا۔ کوئی ایسی زبردست سلطنت نہ تھی جو ان لوٹ مار کرنے والوں کا اتصال کر دیتی۔ لیکن اس پر شہر و شہر زانے میں بھی شمالی جرمنی کے شہروں کی تجارت روز افزوں ترقی کر رہی تھی۔ وہاں یہ حالت تھی کہ ماجرہوں سے سرکاری محصول تو وصول کر لیا جاتا۔ مگر ان کی اور ان کے مال کی کافی حفاظت نہ کی جاتی ساتھ ہی اس کی اجازت نہ تھی کہ ماجرہ خود اپنے مسلح سپاہی ساتھ رکھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان ماجرہوں کا مال بالکل غیر محفوظ تھا۔

جرمنی کے شمالی علاقہ جات میں تجارت روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی۔ ہیمبرگ۔ لوبک۔ اور برہن بڑی منڈیاں قرار پا گئی تھیں۔ ان شہروں کے ماجرہوں کو زیادہ خوف نہ تھا کہ بادشاہ و لاڈلار سے رہا کرتا۔ اور ہمیشہ اُس کے چلے روکنے پڑتے۔ اس کے علاوہ دریائے الب میں بھی قزاق موجود تھے جو چھوٹی چھوٹی تیز روکشیدہ کشتیوں پر ہر جگہ موجود رہتے اور کوئی مال ایک مقام سے دوسرے مقام تک اطمینان کے ساتھ نہ بھیج سکتا۔ پھر خشکی کا راستہ بھی قابل اطمینان نہ تھا۔ یہ ساری خرابیاں خود اسی ملک کے زمینداروں اور ایروں کی بدولت ہو رہی تھیں جنہوں نے ان تجارتی شہروں کے اندر اور وہاں

کے تاجروں کی آمد و رفت میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔
 ان حملوں کے روکنے اور تاجروں کو محفوظ رکھنے کے لیے ۱۲۳۱ء میں تین تجارتی
 شہروں یعنی ہمیرگ، ہاڈسن اور ڈٹ مارش میں ایک معاہدہ ہوا۔ یہ تینوں خود مختار
 اور آزاد شہرتھے یعنی خاص وہاں کے لوگوں کے سوا اور کسی حکمران کی بندوبستی نہ تھی
 وہیں کے لوگ اپنے اپنے شہر کا انتظام کرتے۔ چند روز بعد شہر ہمیرگ اور شہر لوہنگ میں بھی
 ایک خاص قسم کا تجارتی معاہدہ ہوا۔ ان معاہدوں میں یہ قرار پایا کہ یہ تجارتی شہر آپس
 میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اور اگر کسی شہر پر با کسی شہر کے مال و اسباب پر
 راستہ میں بھی کہیں حملہ ہو گا تو سب ایک دوسرے کی حفاظت کریں گے۔

۱۲۳۱ء میں شہر برٹش وک بھی اس معاہدے میں شامل ہو گیا اور موقع کے
 لحاظ سے ہی ان سب شہروں کے لیے مال رکھنے کا گودام قرار پایا۔ پھر اور ترکی کی طرف
 سے ہندوستان کا جو تجارتی مال آتا وہ اٹلی کے بندرگاہوں سے ہمیرگ جاتے ہوئے
 برٹش وک سے گزرتا۔ اس واسطے ہی شہر مال جمع کرنے کا صدر مقام قرار پایا۔ چند روز بعد
 سے شہر بھی اس معاہدے میں شامل ہونے لگے اور اب اس تجارتی اتحاد کا نام ہنسا قرار دیا گیا۔

یونانیک زبان میں نقطہ ہنسا کے معنی کسی خاص حق یا فائدہ کے ہیں۔
 اور بعض لوگ اس کی اصل قدیم فرانسیسی زبان کے لفظ ہنسا سے نکالتے ہیں۔ جس کے
 معنی اُس زبان میں "جماعت یا گروہ" کے ہیں۔ یہ نام خواہ کسی زبان سے لیا گیا
 ہو۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔ اور یہ نام دونوں طرح
 اس موقع پر موزوں معلوم ہوتا ہے۔

یہ تجارتی اتحاد ہنسا بہت کامیاب ثابت ہوا اور چند وزین بہت کمزور اس میں اس میں ترکی ہو گئے
 ایک وقت جب وہ پورے ترقی پزیر تھے تو چاہی شہر اس میں شامل تھے۔ زیادہ تعداد جرمنی
 کے شہروں کی تھی مگر اس میں ناروے، سویڈن، ہالینڈ، فرانس، اٹلی، اسپین، پرتگال
 اور انگلستان کے تجارتی شہر بھی شریک تھے۔

آخر اس اتحاد ہنسا نے اتنی ترقی کی کہ یورپ کے بعض حکمران اسے
 حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اور اپنے اپنے مقبوضہ شہروں کو انھوں نے
 اس اتحاد سے الگ کر لیا۔ مگر اس کے بعد بھی اتحاد ہنسا کی قوت میں کوئی کمی

نہیں آئی کیونکہ جرمنی کے کل شہر اس میں شامل تھے۔ اور اب اتحاد ہنسائے
یہ قاعدہ مقرر کر لیا کہ باہر کا کوئی شہر اس اتحاد میں نہ شامل کیا جائے۔
اسی زمانے میں اتحاد ہنسا کے چار حصے کر دیے گئے۔ اور ہر
حصہ کا ایک صدر مقام قرار پایا۔ پہلے حصہ کا صدر مقام ٹوبک تھا جس
کی نگرانی میں ہیمبرگ۔ روسٹاک اور ڈسمار وغیرہ تھے۔ دوسرے حصہ کا صدر
مقام ڈان تھا جس کے ماتحت کلنو۔ گلدزس اور ڈسٹ فالیا اور اس کے قرب و
جوار کے شہر تھے علاقہ جات سیگنی اور تیرینڈان ہیمبرگ کا صدر مقام تیرینس وک
قرار پایا تیرہ ویشیا اور لیوونیا کے شہروں کا صدر مقام ڈینزنگ ہوا۔

اس اتحاد یا انجمن ہنسا کے اعزازی ممبری اور سرپرست بھی ہونے
جو گرنڈ ماسٹر (آقاے اعظم) کہلاتے۔ ڈیٹمارک۔ سوئیڈن اور نیز اسپین کے
بادشاہ وقتاً فوقتاً اس کے ممبری و سرپرست ہوتے ہیں۔ مگر سو پھوین صدی
کے بعد کوئی ممبری نہیں بنایا گیا۔

اس انجمن نے اپنی تجارت کے گنج اور گودام یورپ کے مختلف مقامات
پر بنائے لندن کا گودام ۱۷۵۷ء میں بنا۔ برڈگس کا علاقہ ۱۷۷۷ء میں۔ واکراڈ کا
۱۷۷۷ء میں اور برگن کا ۱۷۷۷ء میں برڈگس کا گودام چند روز بعد آئسٹن ورپ
میں آیا۔ پھر آسٹریڈم میں مستقل ہو گیا۔

بعض حصہ میں حکمرانوں کی مدد اور بعض کی سرپرستی سے اس
انجمن کو بڑی قوت حاصل ہو گئی ۱۷۷۷ء میں شہر کوٹون میں ایک باضابطہ قانون
بنایا گیا جو کل بلاد ہنسا پر حاوی تھا اور حقیقت یہ ہے کہ چودھویں صدی عیسوی
میں اس اتحاد ہنسا کی بدولت تجارت کا مال بالکل محفوظ ہو گیا۔ اور بادشاہوں
سے لے کر معمولی لوگوں تک ہر طبقہ میں اس خیر کا بڑا لحاظ کیا جانے لگا۔ اُس
زمانے کے حکمرانوں کی نظروں میں تجارت کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ مگر
اسی وقت سے تجارت کی اصل حقیقت ظاہر ہونے لگی اور آخر میں اس کو
وہ درجہ حاصل ہوا کہ اس نے حکومتوں اور سلطنتوں تک کو متا دیا۔
مقام کوٹون میں اس اتحاد ہنسا کے جو قواعد مقرر ہوئے وہ یہ

تھے کہ تجارت کے مال کو چورون اور ڈاکوؤں سے بچایا جائے۔ دوسرے ملکوں میں
ناجروں کا عروج و قار قائم رکھا جائے اور ان کی حفاظت کی جائے جو شہر اتحاد
میں شامل ہیں ان کی تجارت کو مالک غیر میں فروغ دیا جائے اور جہاں تک
ممکن ہو ہر چیز کی تجارت کے ٹیکہ حاصل کر لیے جائیں تاکہ دوسرے شہروں
کے تاجروں اس چیز کو نہ بیچ سکیں۔ اور ہر بازار میں انصاف اور امن قائم رکھا
جائے۔ ان امور کی نگرانی کرنے اور دغا بازوں سے بچانے کے لیے ہر بازار
میں ایما دار عہدہ دار مقرر کیے جائیں جو اس اتحاد ہتساکے ماتحت ہوں۔
اور ان پر کسی کا اثر نہ ہو۔

انجمن کا نظام قائم رکھنے کے لیے ساحلی شہروں کو حکم دیا گیا
کہ مسلح جہاز مہیا کریں تاکہ بحری اور بری راستوں میں تجارت کا مال بہ آسانی
اور بغیر کسی خطرے کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاسکے۔ اتحاد
ہتساکے شہروں کے لیے یہ ضروری تھا کہ اپنے ذمے کی واجب الادا
رقمتیں پابندی کے ساتھ ادا کر دیا کریں۔ عدم قبول یا تاخیر کی صورت میں وہ
شہر اتحادی حقوق سے خارج کر دیا جاتا اور اس مقام کے مال کی کوئی
ذمہ داری نہ رہتی۔

بلاد ہتساک کی انجمن کے باقاعدہ جلسہ عموماً ہر تیسرے سال کو ایک
میں منعقد ہوتے اور یہی شہر اس انجمن کا صدر مقام قرار پایا تھا۔ یہیں انجمن
کا خزانہ اور صدر دفتر بھی تھا۔ اس سہ سالہ جلسہ میں جس شہر کے نمائندے
وقت پر نہ پہنچتے ان پر ہر روز کی غیر حاضری پر مبنی فلاح (تقریباً ڈیڑھ سو
روپیہ) جرمانہ ہوتا۔ اور جس شہر کی طرف سے نمائندے نہ آتے اس سے
باز پرس کی جاتی۔ لیکن کسی شہر کی جانب سے اگر تین دفعہ ایسی ہی غلطی
ہوتی تو وہ اتحاد سے خارج کر دیا جاتا۔ کسی شہر کے ذمے اگر جرمانہ وصول
طلب ہوتا اور وہ فوراً ادا نہ کرتا تو وہ ان کا کوئی باشندہ اگر کسی دوسرے
اتحادی شہر میں مل جاتا تو پکڑ کے قید کر لیا جاتا اور جب تک واجب الادا
رقم نہ وصول ہو جاتی اسے آزادی نہ نصیب ہوتی۔ مالک غیر میں اس اتحاد

کی جو کوٹھیاں تھیں اُن کا انتظام بڑی سختی اور پابندی کے ساتھ کیا جاتا۔ وہاں کے منتظمین اور شہر کے تجارت اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لیے بہت ہی سادی زندگی بسر کرتے۔ کسی عیش و عشرت کے جلسہ میں نہ جاتے۔ اور اُنہیں شادی کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ بعد میں یورپ کی جن عظیم نشان کمپنیوں نے دور دراز ممالک سے تجارت کرنی شروع کی اُن کے قواعد و ضوابط اسی اتحاد ہنساکے اُن قاعدوں کے مطابق تھے جو اُس نے ممالک غیر میں تجارت کرنے کے لیے مقرر کر رکھے تھے۔

اتحاد ہنساکا انتظام بہت اچھا تھا اور اس کا کاروبار ایسی خوبی کے ساتھ جاری رکھا گیا کہ سب اس کی تعریف کرنے لگے۔ اس میں منتظمین کو بڑی سخت اور مسلسل محنت کرنی پڑی تھی۔ مگر عام لوگوں پر اتنا اثر پڑا کہ سب کو اُس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور اُن کا یہ خیال تھا کہ بڑی نیک نیتی اور جانفشانی سے ملک کی خدمت انجام دی جا رہی ہے۔ چند روز میں اُسے بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ مگر باوجودیکہ وہ شہروں اور سمندرون پر حکومت کر رہی تھی لیکن کسی بادشاہ نے ایک حکمران کی حیثیت سے اُسے کبھی نہیں تسلیم کیا۔ اُس کے پاس دولت بٹھا رہی تھی۔ اور آمدنی کے ذرائع غیر محدود تھے۔ لہذا یہ بات خود بہ خود پیدا ہو گئی کہ بادشاہوں کی اطاعت کرنے کے بجائے یہ انجمن بادشاہوں پر حاوی ہو کر اُن کے اوپر حکومت کرنے لگی۔

انگلستان میں اُس نے اپنے اثر سے یہ بات منوالی کہ اتحاد ہنساکے ذریعہ جس قدر مال ملک کے باہر جاتا اس پر کوئی محصول نہ لیا جاتا۔ ڈنمارک سویڈن اور روس میں جو مال اس اتحاد کے ایجنٹوں یا کارکنوں کے ذریعہ ملک کے اندر جاتا اس پر محصول معاف ہو گیا۔ یہ ایسے حقوق تھے جو اُس زمانے کے بادشاہ کسی کو خوشی کے ساتھ کبھی نہ دیتے مگر بات یہ ہے کہ اتحاد ہنساکے روز بروز افراد ترقی اور اس کی بٹھا رہی دولت اور عام لوگوں میں اس کی شہرت اور ہر دلعزیزی کو دیکھ کر یورپ کے سب بادشاہ اُس سے دہنے لگے تھے۔ اتحاد ہنساکے غیر معمولی کامیابی اور ترقی کا راز اس کے زیر اثر شہروں کی وسیع تجارت تھی۔ یہ شہر پہلے ہی سے تجارت کے مرکز واقع ہوئے

تھے۔ اب اس اتحاد کی بدولت انجمن امن اور اطمینان نصیب ہوا تو دفعۃً ایسے بڑے کہ سب کو حیرت ہونے لگی۔ ان شہروں کے عروج کے ساتھ ساتھ اتحاد ہنسا کی بھی ترقی ہوتی گئی۔ آخر یہ حالت ہو گئی کہ سارے یورپ میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا تجارتی مقام یا بازار ایسا نہیں رہ گیا جو اس تجارتی اتحاد کے اثر میں نہ آ گیا ہو۔ اس کی ترقی کا دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ اتحاد کے پاس بہت سی فوجیں اور جنگی جہاز موجود تھے۔ ابتدا میں یہ اتحاد مال تجارت کی حفاظت یعنی اس مال کو حملہ آوروں سے بچانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اُسے ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر بعد میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اکثر خود اس اتحاد نے اعلان جنگ کر کے دیگر ممالک پر فوج کشی کی۔ اس نے ناروے کے دو بادشاہوں آریک اور ہاکون کو مغلوب کیا۔ فلاڈی مارٹن لٹ شاہ ڈنمارک کے مقابلے میں اعلان جنگ کر کے فوج کشی کر دی۔ اتحاد ہنسا کے جہازوں کا جنگی بیڑا ڈنمارک کے دارالسلطنت کوپن ہیگن تک جا پہنچا اور بادشاہ کو مجبوراً شہر چھوڑ کے بھاگ جانا پڑا۔ پھر صلح اس شرط پر ہوئی کہ سلطنت ڈنمارک کا جزیرہ شوئن سولہ سال کے لیے اتحاد ہنسا کے قبضہ میں دے دیا گیا۔ یہ جزیرہ بحیرہ بالٹک کے دامنہ پر واقع ہے۔ لہذا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا بحیرہ بالٹک اتحاد ہنسا کے زیر اثر ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس اتحاد کے جنگی بیڑے نے سویڈن کے بادشاہ کو تخت سے اُتار کے اُس کا تاج و تخت اپنی مرضی کے مطابق ممکن برگ کے ڈیوک آلبرٹ کے حوالے کر دیا۔ مسئلہ ۶ میں اس اتحاد کوپن ہیگن پر دوبارہ فوج کشی کا ارادہ کیا اور ۲۴۸ جنگی جہاز آراستہ کر لیے جن پر بارہ ہزار سپاہی سوار تھے۔ مسئلہ ۷ میں برگنس وک کے ڈیوک نے خاص شہر برنس کا محاصرہ کر لیا مگر اتحاد ہنسا کی فوجیں اس آزاد شہر کی مدد کے لیے پہنچ گئیں اور ڈیوک کو محاصرہ اٹھاتے ہی بنی شہر ڈان زگ کے محوٹ کر اتحاد ہنسا کی مدد پر اتنی جرات ہوئی کہ اُس نے شاہ ڈنمارک کے مقابلہ میں جنگ کا اعلان کر دیا۔

انگلستان ڈنمارک اور ہالینڈ کو اپنی تجارت قائم رکھنے اور اسے

وسعت دینے کے لیے بلاد ہنسا کی انجمن سے تعلقات رکھنے پڑتے۔ اس اتحاد نے بحر شمالی اور مشرقی یورپ میں ڈاکوؤں اور راہزنوں کا بڑی کامیابی کے ساتھ استیصال کر دیا تھا۔ اس نے بحری قوانین بھی مقرر کر دیے تھے جن کی وجہ سے بڑا امن ہو گیا اور ہر جگہ ایک ہی سا طریقہ رائج تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے شمالی یورپ میں بہت سے بندرگاہ اور چوڑی نہریں بنوا دیں جن میں جہازوں کی آمد و رفت ہونے لگی اور تجارت کے نئے راستے کھل گئے۔ مگر سب سے زیادہ نمایاں کام جس سے اس کے اثر اور اقتدار کا پتہ چلتا ہے یہ کیا کہ مختلف اور دور دراز ممالک میں ایک ہی قسم کے وزن اور پیمانے رائج کر دیے۔ اس سے ہر جگہ کے تاجروں کو خرید و فروخت اور تبادلہ اشیاء میں بڑی آسانی ہو گئی۔ اتحاد ہنسا کی ترقی اس وجہ سے ہوئی تھی کہ اُس زمانے کی حکومتیں

مکرو رتھین اور بحری قزاقوں کا استیصال نہیں کر سکتی تھیں۔ اب یورپ میں طاقتور سلطنتیں پیدا ہو گئیں۔ باقاعدہ حکومتوں نے امن و امان کا ذمہ لے لیا۔ بحری ڈاکہ زنون کا پہلے ہی خاتمہ ہو چکا تھا۔ یورپ کے بادشاہوں نے خود بھی تجارت کرنی اور اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے شہروں کو یہ نظر آیا کہ بڑے تجارتی شہروں نے ہمارے حقوق پامال کر ڈائے ہیں۔ بڑے شہر بھی اب بحری مرکز نہیں باقی رہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ کولمبس اور واسکو دی گاما نے امریکہ اور ہندوستان کے راستے کھول دیے۔ یورپ کے حالات میں جب تبدیلیاں ہوئیں تو اتحاد ہنسا کا زور بھی ٹوٹ گیا اور اس کا تخریب شروع ہو گیا۔

اگر اُس وقت جرمنی کی حکومت فرانس یا انگلستان کے مقابلے کی ہوتی تو وہ اپنے ان شہروں کی محافظ بن کے بیرونی علاقہ جات میں اس کی تجارت قائم رکھنے کی کوشش کرتی۔ مگر واقعہ اس کے برعکس تھا۔ اتحاد ہنسا کوئی ایسی سلطنت یا حکومت نہ تھی جسے دیگر ممالک نے تسلیم کر لیا ہو۔ وہ صرف ایک تجارتی انجمن تھی جب اُن طاقتور سلطنتوں نے خود تجارت کرنی شروع کی تو اس انجمن کو دبا دینا چاہا۔ یورپ کی مشہور تیس سالہ جنگ "میں اتحاد ہنسا کی ساری

جنگی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ تجارتی حقوق جو اسے بیرونی ممالک میں حاصل ہو گئے تھے وہ بھی رفتہ رفتہ اُس سے نکلنے لگے۔ یہ اتحاد باہمی نفع کے خیال سے وجود میں آیا تھا۔ جب اس سے کوئی فائدہ نہیں نظر آیا تو چند ہی روز میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ سلسلہ ۶۱ میں اس اتحاد کا سب سے آخری جلسہ شہر لوہک میں منعقد ہوا۔ مگر اس میں جتنے ارکان شریک ہوئے وہ اپنے شہروں کی طرف توجہ و درخواست کو کرتے تھے کہ بہن مجلس سے علیحدگی کی اجازت دی جائے۔

اس کے بعد بھی تین شہر تمبرگ۔ لوہک اور ترمین اس اتحاد کے نام لیوا باقی رہ گئے۔ انھوں نے آپس میں وہی تعلقات قائم رکھے اور ہنساک کے نام کو زور رکھنا چاہا۔ سلسلہ ۶۲ کے عہد نامہ میں ان تینوں شہروں کی اتحادی مجلس ہنساک تسلیم کی گئی۔ پھر سلسلہ ۶۳ میں جو کانگریس آسٹریا کے دار السلطنت ویانا میں ہوئی اُس میں بھی ان شہروں کے متحدہ حقوق تسلیم کیے گئے اور ایک شہر فرنگ فرٹ کو بھی اسی قسم کے حقوق دے کر جرمنی کے اتحاد ہنساک میں شامل کر دیا گیا۔

مگر اس کے بعد ہنساک نام بالکل مٹ گیا۔ ہر شہر تجارتی حیثیت سے آزاد ہے اور اُس قسم کا کوئی تجارتی اتحاد دوسرے شہروں سے نہیں قائم رہا اور اس اتحاد نے ہر شہر میں جو تجارتی کوٹھیاں بنالی تھیں فروخت کر دی گئیں۔ لندن کی کوٹھی سلسلہ ۶۴ میں اور آسٹریا کی کوٹھی سلسلہ ۶۵ میں بیچی گئی جس پر اس اتحاد کا خاتمہ ہو گیا۔ اس انجمن نے اُس زمانے میں ملک کی تجارت کو محفوظ کر دیا تھا جبکہ سارے یورپ میں کوئی سلطنت ایسی نہ تھی جو اس کام کو اس خرابام دیتی اور انگلستان کی پارلیمنٹ میں اتحاد ہنساک متعلق کہا گیا کہ اُس نے ملک کو اصول تجارت کی بہترین تعلیم دی ہے۔ اتحاد ہنساک نے آخر میں یہ کوشش شروع کی کہ ملک کی ساری تجارت اپنے ہاتھ میں لے لے اور کسی کو تجارت کرنے کا اختیار نہ ہو۔ دراصل یہی چیز اُس کے منزل کا باعث ہوئی۔

تیسری صدی ہجری کا ایک عی نبوت صاحب الزنج

عباسی خلیفہ المتمدی باللہ تخت خلافت پر رونق افروز ہوا ہی تھا کہ ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور خلیفہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا پورا نام علی بن محمد بن عبد الرحیم تھا۔ مگر عربی تاریخوں میں صاحب الزنج کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس نے زندگی یعنی حبشی غلاموں کو بھکا کے اپنے ساتھ کر لیا تھا اور وہی زیادہ تر اس کے طرفدار تھے۔ یہ شخص بنی عبد القیس سے تھا۔ اور سرمن اسے میں رہتا تھا۔ پھر وہ الملوک کے بیٹے المنصور کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ اور اُس کی تعریف میں اشعار کہا کرتا تھا المنصور اس کو کچھ دے دیا کرتا تھا آخر وہ مسئلہ میں سرمن اسے سے بحرین میں چلا آیا اور یہیں آکے اُس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا میں حضرت علی کی اولاد میں ہوں۔ حضرت علی کو اپنا جد ثابت کرنے کے لیے اپنا نسب یوں بیان کرتا۔ علی بن محمد بن احمد بن موسیٰ بن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما۔ اور کبھی کہتا کہ میں حسین بن عبید اللہ بن عباس بن علی بن ابی طالب کی اولاد میں ہوں اور لوگوں کو اپنی اطاعت و اقتدا کی دعوت دیتا۔ اس طرح کچھ لوگ اُس کے ساتھ شریک ہو گئے اور اسے بنی مان لیا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی مخالفت بھی شروع ہو گئی کیونکہ بہت سے سچے مسلمان تھے جو اُس کے دعوؤں کو جھوٹا جانتے۔

آخر موافقین اور مخالفین میں اس قدر رنج بڑھا کہ لڑائی کی نوبت آگئی جس میں چند آدمی قتل ہوئے۔ بحرین کے بعض لوگ اُسے بنی سمجھتے۔ اُس کو خراج ادا کرنے۔ اس کے احکام کی تعمیل کرتے۔ اور اس کی طرفداری میں بادشاہی فوج سے لڑتے تھے۔ مگر جو سچے مسلمان تھے وہ خلیفہ کے مطیع فرمان رہے۔ اور انھوں نے باغیوں کو اس قدر دبا یا کہ اُن کے بنائے کچھ نہ بنی۔ اور صاحب الزنج بحرین سے بھاگ کے آحار میں چلا آیا۔ اس وقت بحرین والوں کی ایک جماعت اُس کے ساتھ ہو گئی تھی

گرا سے احسا میں بھی پناہ نہ ملی اور اپنے ہمراہیوں سمیت مختلف جنگوں میں مارا پھرنے لگا۔

اسی اثنا میں وہ ایک دن کہنے لگا کہ جنگل میں مجھ پر کچھ ایسی نشانیاں نمودار ہوئی ہیں جن سے میری امامت اور نبوت ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ مجھ کو قرآن کی بعض سورتوں کی تلقین ہوتی جو مجھے فوراً ازبر ہو گئی ہیں۔ اور وہ بسمک الذی۔ سورہ کہف اور سورہ قص ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب میں غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں پہنچتا ہوں وہاں کی زمین سرسبز اور بار آور ہو جاتی ہے۔ اور ابر میرے اوپر سایہ شگے رہتا ہے۔ پھر اسی ابر سے مجھ کو ایک آواز سنائی دیتی کہ بصرہ چلے آؤ۔ غرض اسی قسم کی بیودہ باتیں بیان کر کے لوگوں کو گمراہ کرتا تھا۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ اس شخص نے دعویٰ کیا کہ میں لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تو لوگوں نے اس کی رسالت سے انکار کر دیا۔ اُس کے پاس ایک منبر تھا جس پر چڑھ کے حضرت عثمان حضرت علیؓ معاویہؓ زبیرؓ طلحہؓ اور سیدتنا عائشہؓ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کو گالیوں دیا کرتا تھا۔ تاریخ ابن اثیر اور ابن خلدون میں ہے کہ وہ خارجیوں کا ہم خیال تھا۔ اس سے اُس کا یہ دعویٰ کہ حضرت علیؓ کی اولاد میں ہے غلط ثابت ہوتا ہے۔

سب سے پہلے وہ ۵۵ھ میں عام لوگوں کے سامنے نمودار ہوا۔ اس سے پہلے وہ اپنی کارروائیاں خفیہ طریقہ سے کرتا رہا تھا۔ اب اُس نے خلافت کی مخالفت شروع کی اور ان غلاموں کو دعوت دی جو اطراف بصرہ میں لوگوں کے پاس تھے۔ اس کے گرد بہت سے غلام جمع ہو گئے۔ تاریخ نے اُن سے آزاد کا وعدہ کیا اور مختلف احسانات کی امید دلائی۔ جب اُن غلاموں کے مالکوں میں سے کوئی اپنے غلام کو مانگنے آتا تو وہ اپنے غلاموں کو بلو کر اُس کے آقا کو خوب بٹواتا۔ پھر اُسے قید کر دیتا اور چند روز تکلیفیں دے کے چھوڑ دیتا۔ لوگوں نے یہ دیکھا تو اپنے فرار شدہ غلاموں کا مطالبہ چھوڑ دیا۔

صاحب الزنج ان غلاموں اور اپنے دوسرے ہزار بیوں کو ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا۔ اور اپنی پیروی کی ترغیب دیا کرتا۔ تاکہ لوگ ساتھ چھوڑ کے نہ چلے جائیں۔ زنجی غلام اپنے آقاؤں کے پاس سے بھاگ بھاگ کے برابر اس کے پاس آتے رہتے اور اُس کے مطیع ہوتے جاتے۔ اب اُس نے اپنی فوج کے لیے ایک جھنڈا بنوایا جس پر یہ آیت قرآنی لکھی ہوئی تھی۔ **إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَوْقَعَهُمْ** **بِأَنَّهُمْ لَهِمُّ الْجَنَّةِ** (خدا نے مسلمانوں سے اُن کا نفس اور مال جنت کے عوض میں خرید لیا ہے) غرض ان ترکیبوں سے اس کی جماعت روز بروز بڑھتی گئی۔ یہ لوگ بد معاشیان اور لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ لوگوں کو ستاتے اور اُن کا مال و اسباب زبردستی چھین لیتے۔

اس کے بعد صاحب الزنج شہر آبلہ کی جانب گیا۔ وہاں کے لوگوں نے اُس کا مقابلہ کیا مگر شکست ہو گئی۔ اور شہر پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا۔ پھر اُس نے قادیسہ کی جانب رخ کیا۔ اُس کو فتح کر کے خوب لوٹا۔ اب اُس کے پاس بہت سا مال و اسباب اور کافی تعداد میں ہتھیار جمع ہو گئے۔ اہل نصرہ کو اس کی ان زیادتیوں کی خبر ملی تو وہ مقابلے کے لیے نکلے مگر اُنھیں بھی شکست ہو گئی۔ صاحب الزنج نے نصرہ کے شکست خوردہ لوگوں میں سے بہتوں کو قتل کر کے اُن کے ہتھیار اٹھائے۔ فیض میں کر لیے۔ اس کے بعد اور کئی جماعتیں اُس کے مقابلے پر آئیں مگر اُنھیں بھی شکست اٹھانی پڑی۔ پھر وہ پھر دو قافلہ فوجیں لے کے اس کی سرکوبی کو بڑھے مگر اُنھیں بھی کامیابی نہ ہو سکی۔ باغیوں کے مقابلے میں شکست اٹھانی پڑی اور ایک قافلہ بھی قتل ہو گیا۔ ان قافلہ داروں کے ساتھ بہت سی کشتیاں بھی تھیں جو ہوا کی تیزی سے کنارے پر آ لیکن ان میں بہت سا قیمتی مال و اسباب اور اسلحہ تھے۔ اُنھیں باغیوں نے جی بھر کے لوٹا۔

جب حالت بیان تک پہنچی تو اس فتنہ کو دفع کرنے کے لیے ترکی پہ سالار ابو ہلال چار ہزار فوج کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ مگر اسے بھی جاتے ہی شکست ہو گئی اور اُسکی فوج والے بہت زیادہ قتل ہوئے۔ پھر پہ سالار ابو منصور ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ بھیجا گیا اور اُس نے جا کے اس فتنہ کو دبا دیا۔

صاحب الزنج کے ساتھیوں میں یحییٰ بن خالد اور سلیمان بن جامع بڑے نامی لوگ تھے اور یہی اُس کی فوجوں کے افسر تھے۔ سو رجین کے ملازموں میں رجا نے سب سے پہلے اُس کا ساتھ دیا اور اُس کا شریک ہو گیا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ میں اپنے آقا کے غلاموں کا داروغہ تھا۔ اور اُن کے کھانے پینے کا بندوبست کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے صاحب الزنج کے چند ساتھیوں نے مجھ کو گرفتار کر لیا اور اُس کے پاس لے گئے اُس نے کہا کہ اب تم میرے بطع ہو جاؤ اور میرا کہنا ناؤ۔ میں نے منظور کر لیا تو اس نے مجھ سے پوچھا تم کہاں سے آئے ہو۔ میں نے بتا دیا تو پھر پھر کے حالات پوچھے میں نے جواب دیا میں کچھ نہیں جانتا۔ پھر اس نے سو رجین کے غلاموں کے متعلق پوچھا۔ میں نے اُن کے حالات بیان کر دیے۔ اس کے بعد اس نے مجھے اپنے مذہب کی دعوت دی۔ میں نے اُسے بھی قبول کر لیا۔ پھر اُس نے مجھے حکم دیا کہ تم سے جس قدر ہو سکے زنجی غلاموں کو دھوکا دے کے یہاں لے آؤ۔ اور مجھ سے وعدہ کیا کہ تم کو اُن سب کا افسر بنا دوں گا۔ دوسرے دن میں واپس گیا۔ اور زنجی غلاموں کی ایک بڑی جماعت کو ہٹا کے لے آیا۔

اسی طرح اور لوگوں کو بھی اُس نے مقرر کر رکھا تھا جو غلاموں کو ہٹا کر اور فریب دے کے اس کے پاس لے آتے تھے۔ بصرے اور دیگر مقامات کے غلام برابر آتے رہے۔ اور وہ سب آزادی اور آئندہ ترقی و بہبودی کی امید پر اُس کے ساتھ ہو جاتے۔ اس طرح اس کے پاس غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی اُس نے ان سب کے سامنے ایک تقریر کی اور وعدہ کیا کہ تم سب کو افسر مقرر کروں گا۔ بہت کچھ مال و اسباب دونوں گا۔ اور زمین کھا کھا کر اطمینان دلایا کہ کبھی تم سے یونانی نہ کروں گا۔ اور تمہیں ذلیل نہ ہونے دوں گا۔ اور تمہارے ساتھ احسان کرنے کوئی نہ کرے گا۔ اٹھارہ کھون گا۔ اسی اثنا میں بعض غلاموں کے آقا اُس کے پاس آئے اور اپنے اپنے غلاموں کا مطالبہ کر کے کہا کہ ہم ہر غلام کے بدلے آپ کو پانچ دینار دین گے۔ مگر اس نے اُن کو منہ کے بھل گرا دیا اور اپنے ہمراہی غلاموں کو حکم دیا کہ ہر غلام اپنے آقا کے پانچ پانچ کوڑے لگائے۔

صاحب الزنج جب کبھی غلاموں کے سامنے تقریر کرتا تو اُن کو اگلی تکلیف دے

زندگی یاد دلالتا۔ اور کہتا غور کر۔ پہلے تم لوگ کیسی سخت زحمت اور مشقت میں مبتلا تھے۔ پھر خدا نے اپنی مہربانی سے تم کو اس بلا سے نجات دی۔ اور آزاد کروایا۔ اب میں تم کو ملندی پر پہونچانا اور لونڈی غلاموں اور مال و دولت کا مالک بنادینا چاہتا ہوں۔

ایک زنجی رئیس جس کی کینیت ابو صالح تھی اُس کے پاس نین سو غلام لے آیا۔ اسی طرح مختلف تدبیروں اور چالاکوں سے جب اس کی فوجی قوت خوب بڑھ گئی تو انھیں غلاموں میں سے بعض کو اُس نے افسر مقرر کر دیا۔ اور اس کا اعلان کیا کہ جو شخص کسی غلام کو لائے گا وہ اسی کے متعلق کر دیا جائے گا۔ فرض روز بروز اُس کے ساتھیوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ہزاروں کی تعداد میں زنجی غلام اور دوسرے لوگ اس کے حلقہ گوش جوتے گئے۔ اب اُس نے دیہاتوں اور شہروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ خلیفہ نے کئی بار اس کی سرکوبی کے لیے فوجیں روانہ کیں۔ لیکن یکے بعد دیگرے سب کو شکستیں ہوئی گئیں۔ وہ ان لوگوں کو قتل کرتا اور شہروں اور دیہاتوں سے عورتوں اور بچوں کو کچرے جاتا۔ یہ حالت چودہ سال تک قائم رہی۔ آخر اسلامی فوجوں نے اس پر غلبہ پایا اور ملک میں امن و امان قائم ہوا۔ علامہ جمال الدین سیوطی تحریر فرماتے ہیں کہ اس مکار شخص نے پندرہ لاکھ مسلمانوں کو قتل کیا۔ بصرہ میں فقط ایک ہی دن میں تین لاکھ آدمی اس کی ستم آرائیوں کے شکار بنے۔ جب اُس کی قوت بہت زیادہ ہو گئی اور اس کے ظلم کی کوئی انتہاء نہ رہی تو اس کے مقابلے کے لیے توفیق طلحہ بن متوکل مقرر ہوا جو خلیفہ معتمد علی اللہ بن متوکل کا بھائی تھا۔ بعض فوجوں کی افسری کے لیے اُس کا بیٹا بھی ساتھ روانہ ہوا جو معتمد علی اللہ کے بعد متعتمد کے لقب سے خلیفہ ہوا۔

علامہ سعودی اپنی تاریخ مروج الذهب میں صاحب الزنج کے متعلق لکھتے ہیں کہ توفیق اس باغی کے مقابلے کے لیے صرف ۳۰۰۰۰ میں روانہ ہوا۔ اور اپنے بیٹے ابوالعباس کو سوتق جیش کی طرف روانہ کیا۔ صاحب الزنج کا سپہ سالار شعرائی ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا۔ ابوالعباس نے فوراً آگے بڑھ کے محاصرہ کر لیا اور چند روز میں نیرو اسلحہ فتح کر کے جو کچھ مالاوٹ لیا پھر دوسرے

مقامات بھی فتح کر لیے اور جس قدر زنجی ان مقامات میں سے سب قتل کر دیے گئے۔ اس کے بعد توفیٰ آہوا زمین آیا وہاں زنجیوں نے جو خرمیاں پھیلا رکھی تھیں ان کی اصلاح کی اور تبصرہ میں واپس آیا۔ اس کے بعد بھی وہ برابر مقابلہ کر رہا یہاں تک کہ کوئی مقام صاحب الزنج کے قبضہ میں نہیں باقی رہا۔ اور صاحب الزنج گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اُس باغی نے چودہ برس اور چار مہینے کشت و خون کا بازار گرم رکھا۔ اور آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ اس عرصہ میں اس نے لاکھوں چھوٹے بڑے عورت مرد تہ تیغ کیے۔ بہت سے شہروں اور دیہاتوں میں آگ لگا دی۔ اور اس سارے علاقے کو تباہ و برباد کر دیا۔ ایک بار صرف شہر تبصرہ میں اس نے تین لاکھ آدمی قتل کیے۔

اس واقعے کے بعد تہلبلی نے جو صاحب الزنج کے ساتھیوں میں تھا۔ اور اس کا بڑا طرفدار تھا تبصرہ میں ایک منبر نصب کیا وہ جمعہ کو سب کے ساتھ نماز پڑھتا۔ اور اس منبر پر کھڑے ہو کے لوگوں کو صاحب الزنج کے مذہب کی طرف بلاتا۔ بنی عباس کے افسروں اور اکثر صحابہ کو گالیوں دیتا۔ اور ان پر لعنت کرتا۔ تبصرہ میں جو لوگ صاحب الزنج کے تیغ ستم سے بچ رہے تھے جمع ہوئے اور ارادہ کیا کہ تہلبلی کو پکڑ کے قتل کر دیں۔ مگر اُسے خبر ہو گئی۔ اور اس نے مسلمانوں میں پھر قتل عام شروع کر دیا۔ اس میں بھی بہت سے قتل ہوئے۔ بہت سے دربار میں کود پڑے اور ڈوب کے مر گئے۔ کچھ بچ رہے جو مکانات اور تہ خانوں کے اندر چھپ رہے۔ یہ فریب و بے مروتی کے ڈر سے چھپے رہتے۔ اور رات کو غذا حاصل کرنے کے لیے نکلتے تو کتوں کو پکڑ پکڑ کے ذبح کرنے اور کھا جاتے۔ جب کتے نہ ملے تو بلیوں اور چوہوں پر گداز کرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ بھی ختم ہو گئے تو یہ حالت ہوئی کہ ان میں سے جو شخص بھوک کے مارے مر جاتا باقی لوگ اس کو اپنی غذا بناتے۔ خیر کھانے کا تو مر کھپ کے کچھ انتظام ہو جاتا۔ مگر پانی کو یہ لوگ بالکل ترساکرتے۔ ان لوگوں میں ایک عورت بیان کرتی ہے کہ وہ بہنیں آپس میں لڑ رہی تھیں لوگوں نے دونوں کو بھڑکانا شروع کیا کہ کہیں لڑ لڑ کے ان میں سے کوئی مرے تو اس کا گوشت کھاؤ میں آئے۔ وہ عورت بیان کرتی ہے کہ ان

میں سے کوئی آپس میں لڑ کے نہ مری تو ہم لوگوں نے اُن میں سے ایک کو کاٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اور کھا گئے۔ تھوڑی دیر میں اس کی ہن روتی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں اس کی مقتولہ بہن کا سر تھا۔ ہم نے پوچھا کیوں روتی ہو؟ اس نے کہا اُن لوگوں نے اس کا بھی انتظار نہ کیا کہ وہ اچھی موت مرتی بلکہ اس کو زندہ ہی کاٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور مجھ کو کھانے کے لیے صرف اس کا سر دیا ہے حالانکہ میرا حق زیادہ ہونا چاہیے۔ اس طرح کے بہت سے افسوس ناک واقعات اس زمانے میں پیش آئے۔ اور مسلمانوں پر بڑا ظلم ہوا۔ بیان کیا جا رہا ہے کہ اس قیامت خیز زمانے میں جس قدر لوگ قتل ہوئے ہیں اُن کا شمار اور احصاء محال ہے اور خداوند عالم کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ بعض لکھتے ہیں کہ سچاس لاکھ آدمی قتل ہوئے ہیں۔

جب یہ باغی قتل کیا جا چکا اور اس کا سر نیزے پر رکھ کے بغداد میں لایا گیا تو ایک عام جشن منایا گیا۔ مکان اور بازار سب گئے۔ لوگ خلوص دل سے توفیق کو دعائیں دیتے تھے۔ شرعاً لے اُس کی شان میں قصیدے کہے اور وہ لوگ جو باغیوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے اپنے گھربار چھوڑ کے بھاگ آئے تھے اب خوشی خوشی اپنے گھروں کو واپس چلے۔

الغرض یہ چودہ برس مسلمانوں پر بہت سخت گزرے اور اس زمانے میں اُنھیں بڑی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور اس زمانے کا قلم بند ہوا۔

ریویو

شمسوں محزون۔ انگریزی کے شہید و معروف جادو بیان شاعر لندن کی نظمیں بڑی شہرت اور وقعت رکھتی ہیں۔ یہ سب نظمیں نہ ہی رنگ لیے ہوئے ہیں بشرطیں چرن صاحب قدانے ان میں سے جن نظموں کا اردو ترجمہ نظم میں کر دیا ہے۔ پہلی ”پیرے ڈائیں لاسٹ“ چودھری ”پیرے ڈائیں ری گینڈ“ اور تیسری ”سیمپن اگونسٹس“ پہلی کتاب کے ترجمہ کا پہلا ایڈیشن فردوس گم شدہ، دگلڈز پریس میں چھپا تھا۔

شمسون محزون ایک ڈراما ہے جس کا خاتمہ رنج و غم پر ہوتا ہے اس کا پلاٹ انجیل سے لیا گیا ہے اور قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ قضا صاحب نے ترجمہ منٹوئی کے طرز پر بہت خوب کیا ہے۔ قیمت فی جلد ۵ روپے کتاب مشرعیلی حرن صاحب قضا نے بنایا پروڈی انیسکٹر مائرس لاٹوشا روڈ لکھنؤ سے منگوائی جائے۔ پہلی دولون منٹو یاں فردوس گم شدہ ہے اور فردوس باز بافتہ (۸) روپے اسی پتہ سے مل سکتی ہیں۔

ہبارستان - یہ رسالہ جناب اختر شیرانی کی ایڈیٹری میں گزشتہ سال فرنگ لاہور سے ماہانہ نکلتا شروع ہوا ہے ٹائٹل کے اوپر لکھا ہوا ہے "اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ" اور واقعی یہ رسالہ ہے بھی ایسا ہی۔ اس میں تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ کاغذ اور چھپائی بھی اچھی ہے۔ اس میں بعض مضامین اور نظمن بہت ہی قابل قدر شائع ہو سکتی ہیں امید ہے کہ یہ رسالہ بہت ترقی کرے گا۔ چند سالانہ پانچ روپیہ منیجر صاحب ہبارستان فرنگ لاہور کے پتہ سے منگوا یا جائے۔

ادبستان - اردو کا یہ ماہانہ رسالہ حضرت رشید صدیقی کی ایڈیٹری میں بمبئی شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ رسالہ ہبارستان کی طرح یہ بھی "اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ماہوار مجموعہ" ہونے کا دعویٰ دار ہے۔ اور انجمن معین الادب بمبئی کی رہبرستی میں نکلی رہا ہے۔ اس لیے امید ہے کہ جاری رہے گا۔ یہ رسالہ چھاپے تصویریں کئی ایک اور رنگین ہیں چند سالانہ چار روپیہ۔ منیجر صاحب ادبستان - مین روڈ - دادر - بمبئی نمبر ۱۲ سے منگوا یا جائے۔

فانوس - یہ رسالہ بھی چند روز سے ہمارے ہی صوبے کے مقام جھانسی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ یہ مجلس علمیہ جھانسی کا علمی ادبی ماہوار رسالہ ہے جو جناب آفتاب اکبر آبادی کی ایڈیٹری میں نکلی رہا ہے۔ ابھی اس کے دو ہی تین نمبر شائع ہوئے ہیں۔ مگر ہر نمبر اپنے سابقہ نمبر سے بڑھا ہوا ہے۔ چند سالانہ بیس روپیہ۔ منیجر صاحب فافانوس محلہ رائی کا تعزیہ - جھانسی کے پتہ سے خط و کتابت لجائے۔

یہاں ایک نیا نیا شائع ہوا رسالہ ہے جس کا نام ہے "ادبستان"۔ اس کا مدیر ہے جناب اختر شیرانی۔ اس رسالہ کی قیمت فی جلد ۵ روپے ہے۔ اس میں تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ کاغذ اور چھپائی بھی اچھی ہے۔ اس میں بعض مضامین اور نظمن بہت ہی قابل قدر شائع ہو سکتی ہیں امید ہے کہ یہ رسالہ بہت ترقی کرے گا۔ چند سالانہ پانچ روپیہ۔ منیجر صاحب ہبارستان - مین روڈ - دادر - بمبئی نمبر ۱۲ سے منگوا یا جائے۔



آج کل کے اٹلس یعنی جزائی نقشے ساری دنیا کو دو دائروں کے اندر ظاہر کرتے ہیں۔ اُن میں سے ایک دائرے میں ایشیا۔ یورپ۔ اور افریقہ کے براعظم ہوتے ہیں۔ اور دوسرے دائرے میں شمالی اور جنوبی امریکہ۔ ان میں سے ایشیا والے دائرے کو پرانی دنیا اور امریکہ کو نئی دنیا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ فقط اس وجہ سے ہے کہ ہمیں امریکہ کا حال ابھی چند صدیاں گزر رہی ہیں کہ معلوم ہوا ہے۔

لیکن اگر پوچھا جائے کہ ان دونوں میں دراصل پرانی زمین کون سی ہے تو زمین کی ساخت پر غور کرنے کے بعد علم طبقات الارض کے ماہرین اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ساری روئے زمین میں امریکہ کے جنوبی اور شمالی دونوں براعظم زیادہ قدیم ثابت ہوتے ہیں۔ پھر اگر ہم اس پر غور کریں کہ انسان کی پیدائش کو آج سے کتنے برس گزر چکے ہیں تو ہمیں اُن امکانی تغیرات عالم کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا جو خلیق عالم کے بعد روئے زمین پر واقع ہوئے ہوں۔ ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ بحر الکاہل میں اتنے بہت سے جزیرے کس طرح بن گئے۔ یا براعظم ایشیا اور شمالی امریکہ کے شمال میں دونوں کے خشکی کے حصے کیوں اس طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھ آئے ہیں گویا ایک دوسرے سے ملنے اور ملنا فکے کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر الگ کھڑے حسرت کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھتے اور افسوس کر رہے ہیں کیونکہ کوئی بہت بڑی قوت انہیں آپس میں ملنے نہیں دیتی ہے۔ بیشک وہ ملنا چاہتے ہیں

یا کبھی ملے ہوئے ہوں۔

جزائر لوشین اس خیال کو اور تقویت دیتے ہیں اور یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ بحیرہ میزنگ جو آبشیا اور آمریکہ کے درمیان میں واقع ہے نسبتاً بہت کم گہرا ہے۔

یہ تو شمالی حصے کی حالت ہوئی اب جنوب میں دیکھنا ویشینیا کے جزیرے اور ان کے چاروں طرف سمندر کا وہ حصہ جو انھیں گھیرے ہوئے ہے جو گویا ایک بہت بڑا بحری باغ ہے اور ہر قسم کی پھول پتیاں اس کثرت کے ساتھ سطح سمندر کے نیچے سے پیدا ہو کے اوپر نمودار ہو جایا کرتی ہیں کہ کسی دوسری جگہ اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ ان جزیروں پر اور سمندر کے نیچے بھی ہزاروں کی بہت سی اونچی اونچی جوئیان اور بلند زمینیں ہیں جن سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی زمانے میں یہ ایک بہت بڑا براعظم ہوگا جس نے بحر الکاہل کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر رکھا ہوگا۔

یہی حال بحر اٹلانٹک کا ہے اور اس قسم کے تغیرات اس میں بھی غیر ممکن یا تعجب خیز نہیں ہو سکتے۔ جن لوگوں نے اس سمندر کی گہرائیوں کا بغور مطالعہ کیا ہے انھوں نے اس کی تہ میں ایسے بلند حصے مسلسل پائے ہیں جو افریقہ کے مغربی ساحل سے لے کر جنوبی امریکہ تک برابر چلے گئے ہیں۔ بحر اٹلانٹک کی تہ میں یہ بلند حصے اس سمندر کی اوسط گہرائیوں سے اتنی ہی سے بھی کم گہرے واقع ہوئے ہیں۔ اور یہ چیز اس قدیم افسانے کو قرین قیاس کیے دیتی ہے جو ان دونوں براعظموں کی اکثر قوموں میں موجود ہے کہ جاتا ہے کہ کسی زمانے میں ان دونوں براعظموں کے درمیان میں زمین کا ایک بہت بڑا اور شاداب و زرخیز حصہ واقع تھا جس نے ان دونوں خشکی کے بڑے حصوں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ یہ زمین اٹلانٹس کہلاتی تھی اور اسی کی وجہ سے بحر اٹلانٹک کا نام مشہور ہوا۔

افلاطون نے اسی سرزمین اٹلانٹس کی بابت لکھا ہے کہ وہاں بہت سے آباد شہر تھے اور وہ ملک ایک ایسی قوم کا گہوارہ تھا جس کے مال و دولت کی کوئی انتہاء تھی۔ اور جو تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج بھی طے کر چکی تھی۔ قدیم فلسطین کی طرح وہاں بھی ہر شہر کا حکمران ایک

بادشاہ تھا جن کے نام اب بھی یونانی دیو مالامین باقی ہیں۔
 مصریوں میں بھی ایک قدیم روایت یہ چلی آتی ہے کہ اُن کے آباؤ اجداد
 ایک ایسی سرزمین سے آئے تھے جو مغرب کی جانب بہت دور واقع تھی اور
 اٹلانٹس کہلاتی تھی۔ افلاطون سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اٹلانٹس کے لوگ
 زیادہ تر بحری تجارت میں مشغول رہتے تھے۔ اُن کے ساحلی شہروں میں بنیاد
 بندرگاہ بنے ہوئے تھے جہاں بڑے بڑے جہاز اپنے مال اُتارتے اور چڑھاتے
 رہتے۔ روس زمین کے کل حصوں میں وہی تجارتی مال لاتے اور لے جاتے۔
 افلاطون نے جن الفاظ میں اس سرزمین کا ذکر کیا وہ حسب ذیل ہیں۔
 اثنینہ۔ کے کارماے نمایان میں جن کا ذکر ہم تک پہنچ سکا ہے ایک بہت بڑی
 بات یہ بھی ہے جسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یونانیوں
 نے اُس عظیم الشان فوج کو تباہ و برباد کر کے کال شکست دیدی جو بحر اٹلانٹک
 کے اس پار سے آئی تھی۔ اور جس نے یہاں تک جرات کی کہ یورپ پر حملہ کر دیا۔
 یہ بحر اٹلانٹک اُس زمانے میں جہاز رانی کے قابل تھا اور ہر قتل کے سنو نوں کو
 درمیان میں جو آبنائے ہے اُسکے آگے ایک جزیرے تھا جو ایشیائے کوچک اور
 آریا کے متحدہ رقبے سے بہت بڑا تھا۔ اس جزیرے سے ہر شخص بہ آسانی دوسرے
 جزائر میں پہنچ سکتا تھا اور اُن جزیروں سے اُس بڑے حصے زمین تک
 جو سمندر چلا گیا ہے وہ بہت بڑا ہے اُس کے مقابلے میں سارا بحر روم ایک
 بندرگاہ نظر آتا ہے۔ وہ براعظم جو اس عظیم الشان سمندر کے دوسرے جانب
 واقع ہوا ہے بہت بڑا ہے۔ جزیرہ اٹلانٹس امین تین بادشاہ حکومت کرتے
 تھے جن کی قوت اور اختیارات غیر محدود تھے۔ پورا جزیرہ اٹلانٹس اور بہت
 سے چھوٹے چھوٹے جزیرے اور سمندر کی دوسری طرف والے براعظم کے کچھ حصے
 ان بادشاہوں کے قبضے میں ہیں۔ کسی زمانے میں ان بادشاہوں کی حکومت
 افریقہ میں لیبیا اور یورپ میں اٹلی کی سرحد تک پہنچ گئی تھی پھر انھوں نے
 اپنی فوجیں جمع کر کے یہ کوشش کی کہ ہمارے کل ممالک کو ایک حلقے میں تباہ
 کر دیں۔ اور اس علاقے کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیں۔ لیکن انھیں

شکست ہوئی۔ اُن کا حملہ ختم ہو گیا اور ہرقل کے ستونوں کے اس طرف کے کل مالک کو اُن کے جو روغنم سے آزادی حاصل ہو گئی۔ اس کے چند روز بعد ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن اور ایک رات میں بے شمار لڑنے آئے اور ایسا شدید سیلاب آیا کہ وہ ساری زمینیں غرقاب ہو گئیں۔ اور وہ جنگجو قوم سمندر کے اندر فرق ہو گئی۔ پورا جزیرہ آٹلانٹس ہمیشہ کے لیے سمندر کے اندر غائب ہو گیا۔ اور تب سے وہ عظیم الشان سمندر قابل عبور ہو گیا کیونکہ کوئی جہاز اُس میں نہیں چل سکتا۔ اُسکی وجہ یہ بھی ہے کہ جو جزیرے سمندر کے اندر غائب ہو گئے وہ سمندر کی سطح سے دو چار گز سے زیادہ گہرے نہ تھے۔ لہذا ایسے سمندر میں کوئی جہاز نہیں چل سکتا۔

جزائر آٹلانٹس والوں کا یہ حملہ بہت قدیم زمانے میں ہوا۔ اور اُس وقت تک شہر اٹینہ بھی یونانی شہروں میں شامل نہ تھا۔ یونانیوں میں سالانہ ایک عید بھی منائی جاتی تھی جو اسی فتح کی یادگار تھی۔ قدیم یونانیوں میں یہ ایک بہت بڑی روایت تھی اور بہت دنوں سے چلی آتی تھی۔

یونانی حکیم ستولون بھی مصر جانے سے پہلے آٹلانٹس کا حال جانتا تھا۔ لیکن مصر پہنچ کر اُس کو سب سے پہلی مرتبہ اُس جزیرے کا مفصل حال معلوم ہوا اور اُس نے یہ بھی سنا کہ وہ جزیرہ کس خوفناک طریقہ پر سمندر کے اندر غائب ہو گیا۔ دیگر قدیم مورخین بھی جزیرہ آٹلانٹس کا حال لکھتے ہیں اس قسم کی قدیم روایتیں بحر اٹلانٹک کے دونوں جانب لوگوں میں مشہور ہیں۔ اور اب تک چلی آتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جزیرہ آٹلانٹس براعظم افریقہ کا ایک حصہ تھا جو سمندر میں بڑھتا ہوا افریقہ کے ساحل تک چلا آیا تھا۔ بحر اٹلانٹک کے دونوں جانب کے قدیم باشندوں میں اسی روایت کا پایا جانا بلاوجہ نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ اس کی کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہوگی۔ قدیم یونانی مورخین اس زمین کو جسے وہ آٹلانٹس کہتے ہیں ہمیشہ یورپ اور افریقہ کے آگے اسی سمندر میں بیان کرتے ہیں جو انہیں جزائر کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس سمندر نے اپنے نام سے اُس قدیم زمانے کی تاریخی یادگار کو

اب تک لوگوں کے دلوں میں نہیں تو زبانوں پر زندہ کر رکھا ہے۔
یورپ کی کسی زبان میں آٹلانٹک کے کوئی معنی نہیں ہیں اور یہ لفظ
یونانی یا برائی دنیا کی کسی دوسری زبان کا نہیں ہے۔ لیکن میکسکو کی زبان
میں اصل کے معنی پانی کے ہیں۔ اس سے اس زبان میں اور بھی بہت سے لفظ
بنے ہیں مثلاً آتلان کے معنی پانی کے بیج میں ہیں اور اسی سے لفظ آٹلانٹک نکلا۔
کولمبس نے جب براعظم امریکہ کو پایا تو خلیج آرا با کے دہانے پر آتلان نام کا
ایک شہر آباد تھا جہاں ایک اچھا بندرگاہ تھا۔ اب یہ شہر ویران ہو گیا ہے مگر ایک
چھوٹی سی گم نام آبادی آٹلان نام کی اب بھی وہاں باقی ہے۔

آمریکہ کے نقشے کو غور دیکھنے سے ہمیں یہ معلوم ہو گا کہ دریائے آوری کوک
دہانے سے لے کر جزیرہ نامائے فلوریڈا تک سمندر میں بہت سی شاخیں ایسی ہیں
جو سمندر کے مدیاطوفان کی وقت نہیں نظر آتیں۔ یہ ایک بہت بڑے کوہستانی
سلسلے کی ادبھی چوٹیاں ہیں۔ وہ ہارڈ اور اس کی داویان پانی کے اندر چھپی ہوئی
ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ براعظم امریکہ کی خشکی کا ایک حصہ ہو جو اب سمندر کی سطح
کے نیچے ہو گیا ہے۔ اور جس کی وجہ سے شمالی اور جنوبی امریکہ کے درمیان خلیج
میکسکو بن گیا ہے

طبقات الارض کے ایک بڑے ماہر چارلس مارٹن کا یہ دعویٰ ہے کہ جزائر
آزورس۔ کناریز اور مدیرہ اسی سرزمین کے حصے ہیں جو کسی زمانے میں آفریقہ
کو امریکہ سے ملائے ہوئے تھے۔

سرزمین آٹلانٹس کی ان قدیم روایتوں کو اگر ہم کوئی وقت نہ
دیں اور انہیں محض انسانی تخیلات کا ایک کرشمہ سمجھیں تب بھی ہمیں بعض
دیگر اسباب ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین کے ان دونوں بڑے
حصوں میں بہت قدیم زمانے سے انسان کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔
اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ بہت ممکن ہے آتشیا اور شمالی
آمریکہ کسی زمانے میں ملے ہوئے ہوں۔ لیکر فرض کر لیجئے کہ ایسا کبھی نہ تھا۔
اس حالت میں بھی بہت ہی چھوٹی اور معمولی کشتیاں ایک براعظم سے دوسرے

برا عظم تک بہت آسانی کے ساتھ پہنچ سکتی ہیں۔ جزائر الموشین کی وجہ سے یہ راستہ اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ پھر اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ساحلی مقامات کے باشندے قدیم ترین زمانے سے سمندرون میں پھرنے کے عادی ہو رہے تھے اور ان کی زندگی محض سمندر کی پیداوار پر بسیر ہوئی تھی۔ یہ انسان کی فطرت میں داخل کر دیا گیا ہے کہ وہ مصائب سفر کو خوشی سے برداشت کر لیتا ہے۔ بلکہ اس سے لطف اٹھاتا ہے۔ دریافت استعجاب اُس سے مشکل ترین کام بھی کر دیتا ہے۔ لہذا یہ بات تو قیاس میں نہیں آ سکتی کہ وہ باہمی گیر جو سمندر سے اس قدر زبرد ہو گئے تھے اس سرزمین سے ناواقف رہے ہوں جو تھوڑی سی دور ان کے سامنے تھی یہ قرین قیاس ہے کہ ان ساحلی باشندوں نے ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے میں سفر کیا ہو گا۔ اور ہر جزیرے کے مناظر بہ نسبت پہلے کے زیادہ دلچسپ ہونے کی وجہ سے اُنھیں اور آگے کھینچ لے گئے ہوں گے یا تک کہ وہ دوسرے براعظم میں پہنچ گئے۔

انسان عرصہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنی حالت کو پہلے سے زیادہ بہتر بنائے اور اس تلاش میں وہ اکثر دے زمین کے دور دراز مالک میں نکل جایا کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جو چیزیں بیان ہمارے امکان میں نہیں ہیں وہ دوسری جگہ جانے سے بہ آسانی دستیاب ہو جائی گی۔ اس کی عجیب طبیعت کسی حالت میں مطمئن نہیں رہتی۔ سیر و تفریح کا شوق بھی انسان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔ جب ہم ان باتوں پر غور کرتے ہیں تو ہم یقین ہو جاتا ہے کہ انسان بہت ابتدائی زمانے میں ہی ایشیا سے شمالی امریکہ میں پہنچ گیا ہو گا۔ ایک مرتبہ وہاں پہنچ جانے کے بعد جنوب کی جانب سفر کر کے خوش گوار آب و ہوا کی تلاش میں امریکہ کے دونوں براعظموں میں پھیل جانا خلاف قیاس نہیں ہو سکتا۔

بعض اہل رائے اس پر یقین رکھتے ہیں کہ امریکہ میں سب سے پہلے بنی اسرائیل کے وہ قبیلے آئے آباد ہوئے جنھوں نے اپنے وطن کو خیر باد کہی

تھی مگر پھر پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں چلے گئے۔ آشور یا وائے جب بنی اسرائیل کو کپڑے لے گئے ہیں تو اس گز قناری کے زمانے میں یا اس کے بعد ہی بنی اسرائیل کے دس یا بارہ قبیلے بالکل غائب ہو گئے۔ بہر حال تاریخ میں پھر ان کا کین نام و نشان نہیں ملتا۔ یہودی تاریخ میں ان کی نسبت عام طور پر یہی لکھا ہے کہ وہ گم ہو گئے۔ یقینی طور پر تو نہیں کہا جاسکتا مگر بہت ممکن ہے کہ وہی قبائل سفر کرتے کرتے شمالی ایشیا سے امریکہ میں داخل ہو گئے ہوں۔ شمالی ایشیا اور نیز شمالی امریکہ کا موسم بہت تکلیف دہ پاکر ان کا رخ قدرتی طور پر جنوب کی جانب پھرا گیا ہو گا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے اس سفر میں کتنے سال گزر گئے ہوں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ وہ لوگ تکلیفیں برداشت کرنے کے ایسے عادی ہو چکے تھے کہ کسی ایسی خوشگوار اور پُرمان جگہ کی تلاش میں جان اُنھیں مذہبی آزادی حاصل ہوا اور جس جگہ ضروریات زندگی بہ آسانی ہم پورج سکیں اگرماٹھون نے اتنا بڑا سفر گوارا کر لیا ہو تو بعد از قیاس نہیں کہا جاسکتا۔

امریکہ کی آبادی کے متعلق جو کچھ اد پر بیان کیا گیا ان میں سے بعض ضرور قرین قیاس ہیں۔ لیکن بعض امور اور بھی ہیں جن کی تردید کرنا آسان نہیں ہے۔ گو لمبس نے جب جزیرہ تیان سل دیڈر پر قدم رکھا تو اس نے وہاں انسان کی ایک ایسی وحشی قوم دیکھی جو پرانی دنیا کے لوگوں سے بہت مختلف تھی لیکن ایک چیز جو یہاں اور وہاں کے باشندوں میں کیسانی نایاب کرتی تھی یہ تھی کہ ان لوگوں نے بھی کتوں کو شکار کے لیے سدھایا تھا۔ اور گھوڑے کے بعد کتا ہی انسان کا سب سے بڑا رفیق۔ ہمدرد اور مددگار ثابت ہوا ہے۔

گو لمبس نے تو اس نئی دنیا میں فقط وحشی جاہلون کو پایا تھا لیکن اس کے پچیس ہی برس بعد اسپین کا ایک جانناز شخص کو رٹیز سرزمین امریکہ کے بعض حصے دیکھنے گیا۔ میکسکو کے ساحل پر قدم رکھتے ہی اسے یہ دیکھ کے بڑا تعجب ہوا کہ وہاں ایک ایسی قوم آباد ہے جو باوجود اپنی ضعیف الاعتقاد پر ان کے تہذیب کے اعلیٰ مدارج طے کر چکی ہے۔

کو رٹیز کے چند سال بعد پتہ ار وئے امریکہ کے علاقہ پیرو کے اندرونی

جسے میں سفر کیا۔ بیان اُسے ایک ایسی قوم نظر آئی جو میکسیکو والوں سے بھی زیادہ ہوشیار اور دولت مند تھی۔ یہ دونوں قومیں علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں اور غور کرنے سے ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ان کے عقائد مصریوں اور قدیم ایرانیوں سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے۔ ان کے حروف جو تعداد میں چھبیس تھے تقریباً سب کے سب یونانیوں اور شام والوں کے حروف سے بہت مشابہ تھے۔ ان کے سال کی مدت ہمارے سال کے برابر تھی۔ جیسا کہ میں وہ کسر اور اعشاریہ سے بخوبی واقف تھے اور ریاضی میں اتنی ہمارت حاصل کر لی تھی کہ انھوں نے فن تعمیر میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان کے ان کاموں کو دیکھ کے ہمارے زمانے کے بہترین انجینئر بھی تعجب کرتے ہیں۔ اس قسم کی شہادتیں ہیں اس بات کے ماننے پر مجبور کرتی ہیں کہ امریکہ کے قدیم باشندے مصریوں یا دیگر مشرقی قوموں سے ضرور کوئی خاص تعلق رکھتے تھے۔ یہ ترقی یافتہ قومیں اگرچہ امریکہ کے مغربی ساحل پر پائی گئیں مگر امریکہ کے دیگر مقامات میں بھی قدیم تہذیب کے آثار بخوبی ملتے ہیں۔

اب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ جنوبی امریکہ میں مغرب کی جانب سے انسان پہنچ سکا ہو یا نہیں۔ بظاہر تو یہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ اتنا وسیع سمندر درمیان میں حائل ہے۔ لیکن غور کرنے سے امکان کی صورت نظر آنے لگتی ہے۔

بحرالکابل کے جزائر میں دو قسم کے جہاز بہت قدیم زمانے سے پائے جاتے ہیں جو دور و دور از سمندرون میں جا سکتے تھے۔ ایک قسم کے جہاز جاپان والوں کے بیان بنائے جاتے تھے اور دوسری قسم ٹونگا اور سوسائٹی کے جزائر میں پائی جاتی تھی۔ کوکبیس سے بہت پہلے اہل فیثقیہ نے ان سے بہت چھوٹے اور کمزور قسم کے جہازوں میں بہت بڑے بحری سفروں کی جہازت کی تھی۔ جزائر ٹونگا کے باشندے قدیم ترین زمانے سے جزائر سماوا، فجی اور تیوہیریہ میں آتے جاتے تھے جو ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ دور و دور از جزائر میں

اُن کی آمد و رفت تھی۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ بحر الکاہل کے کل جزیرہ دن میں ایک دوسرے سے آمد و رفت تھی۔ ان جزائر کے باشندوں کی نسبت یہ بات بھی اب قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ قدیم ترین زمانے میں بھی وہ بڑے مشاقی جہاز ران تھے۔ اپنی کشتیوں یا چھوٹے چھوٹے جہازوں کو اس بحر اہدیا کنارین ڈال دیتے تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ کھلے سمندر میں وہ ساروں کے ذریعہ اپنا راستہ قائم رکھتے۔ مگر بڑے ماہرین کی سمجھ میں بھی یہ بات پوری طرح نہیں آسکی ہے کہ وہ جہاز رانی میں دراصل کس علم سے کام لیتے تھے۔

جزائر آلیسٹر میں جو جنوبی امریکہ سے وسطیہ دور ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہیں پتھر کے بہت سے بت دستیاب ہوئے ہیں جن کے چہرے جوائر ملایا کے اصلی قدیم باشندوں سے بہت مشابہ ہیں۔ اس سے یہ امر یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جزائر ملایا والے سمندر میں اتنی دور و نزدیک درہنہ کی جاتے تھے۔ اور جب دو ڈھائی ہزار میل کھلے سمندر میں جاسکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ جزائر آلیسٹر کے اور آگے ڈیڑھ دو ہزار میل نہ جاسکے ہوں۔ یا اُٹھوں نے اور آگے بڑھنے کی جرأت نہ کی ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانہ میں جزائر ملایا والوں کی ایک عظیم الشان

سلطنت قائم تھی۔ اور بحر الکاہل کے کل جزیرے اسی حکومت کے تابع فرمان تھے جس وقت اس سلطنت کی ابتدا ہوئی اُس پر زمانہ ماقبل تاریخ کی روایتوں کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اکثر قدیم سیاح اپنے سفر ناموں میں اس عظیم الشان سلطنت کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک سیاح جو بڑا قابل شخص ہے لکھتا ہے کہ اس بادشاہ کے زیر اثر بے شمار جزیرے ہیں۔ نہایت تیز چلنے والے جہاز پورے دوسرے دن میں بھی اُن کے گرد گھوم کے نہیں آسکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ قدیم سلطنت اُن سب جزائر پر حاوی ہو گئی جو بحر الکاہل میں واقع ہیں۔ وہی سیاح یہ بھی بتاتا ہے کہ اس سلطنت نے جہاز رانی میں بڑی ترقی کی تھی۔ وہاں جہازوں کے بہت سے بڑے تھے۔ اور بیشمار جہاز تجارتی مال لاتے اور لے جاتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے صنعت و حرفت میں بھی خاصی ترقی کی تھی۔ بہت سال خود اُن کے بیان بنتا تھا جسے وہ جہازوں کے ذریعہ دوسرے ممالک میں لے جاتے پچھتے تھے

اُن کے زیور اور سکہ چاندی سونے کے تھے۔

اس عظیم شان سلطنت کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جزائر ایسٹریمن جو بہت دور سمندر میں واقع ہوئے ہیں ملائی زبان کے الفاظ ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ جزائر بحر الکاہل کی زبانیں آپس میں اتنی ملتی جلتی ہیں کہ مختلف جزائر کے لوگ ایک دوسرے کی زبانیں بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ یہ اسی ملائی سلطنت کے اثر سے ہوا۔ اس وسیع سلطنت کا صدر مقام جزیرہ جاوا میں موجودہ شہر جے دیا سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اب بھی اُس کے کھنڈر باقی ہیں جن پر ایسی شان اور فن تعمیر کی ایسی مہارت نمایاں ہوئی ہے کہ آج کل کے لوگ اُسے دیکھ کے حیران رہ جاتے ہیں۔

ان سب کے سوا ایک اور خیال بھی پیدا ہوتا ہے اہل فنیقیہ پر اسے زمانے میں بڑے جہاز ران تاجر گزرے ہیں۔ ان کا صدر مقام ارض مقدس کا ساحلی شہر قناٹر تھا جو کسی زمانے میں بڑا آباد اور بارونق شہر تھا۔ یہ لوگ جہاز رانی میں بڑے مشاق گزرے ہیں۔ روم اور قناطر جہنہ کے کل علاقہ جات میں انھیں کے جہاز مال و اسباب لاتے اور لے جاتے تھے۔ ان کے جہاز بحیرہ روم کے اندر ہی نہیں چکر لگاتے رہتے تھے بلکہ آبنائے جبرالٹر کے باہر سمندر میں بھی لگ جاتے تھے اور افریقہ کے مغربی ساحل پر دور دور از ممالک تک پہنچ جایا کرتے۔ ان بہادر جہاز رانوں کا اتنا حال تو ہم کو یقینی طور پر معلوم ہے مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ اپنی تجارت کو پھیلانے کے خیال سے اُنھوں نے اور آگے بڑھ کے اٹلی سمندر میں چکر لگائے ہوں اور بہت ممکن ہے کہ امریکہ کے ساحل تک پہنچ گئے ہوں مگر یہ صرف قیاس ہے اس کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی۔

یہ سب صورتیں اس کی ہیں کہ امریکہ میں انسان کس طرح پہنچ سکا ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ صحیح طور پر کوئی نہیں جاسکتا کہ امریکہ میں انسان کیسے جانے آباد ہوا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ انھیں میں سے کوئی نہ کوئی صورت ہوئی ہوگی۔ آسپین میں جب عربوں کی حکومت تھی تو اس زمانے میں بھی بعض من چلے ملاحوں نے سمندر میں بہت دور تک چکر لگایا تھا اور کسی نامعلوم

زمین کی تلاش میں بہت دور تک نکل گئے تھے مگر ان کی ہم کامیاب نہیں ہوئی اور انھیں واپس آنا پڑا۔ اس کا حال مشہور ہسپانی مورخ کانڈی نے اپنی تاریخ ہسپانیہ عرب میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یورپ والوں میں اٹلانٹک کے اس پار کسی زمین کے موجود ہونے کا خیال پہلے سے ضرور موجود تھا۔

امریکہ میں انسان کے پہنچ جانے کے بعد پھر اس دنیا سے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ اور کسی کو اس دنیا کا حال نہیں معلوم تھا۔ مسئلہ عیسوی کے قریب تارن لوگوں نے جہاز رانی میں ترقی کی اور سمندرون میں دور دور تک نکل گئے۔ یورپ سے وہ جزیرہ آئیس لینڈ میں گئے۔ اور وہاں سے گرین لینڈ میں پہنچے۔ اور وہاں اپنی ایک نوآبادی قائم کر لی۔ گرین لینڈ سے امریکہ کے ساحل کچھ دور نہیں ہیں۔ اور ان کے تجارتی جہاز امریکہ میں بھی جانے آئے گئے تھے۔ اس کی زیادہ تر یہ وجہ تھی کہ گرین لینڈ میں اکثر برف جمی رہتی۔ اور درخت بہت بڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ لہذا وہاں مکان بنانے کے لیے لٹھوں کی ضرورت پڑتی جو امریکہ سے لائے جاتے۔ کیونکہ وہاں گھنے جنگل کی کوئی کمی نہ تھی۔ اور لکڑی بہ افراط پیدا ہوتی۔ گرین لینڈ سے یہ لوگ جا کے امریکہ سے لکڑیوں کے لٹھے لے آتے۔ پھر ان تارن لوگوں نے امریکہ کے ساحل پر بھی اپنی ایک نوآبادی قائم کر دی تھی۔ مگر امریکہ کے قدیم باشندوں نے انھیں وہاں نہیں ٹھہرنے دیا اور چند سال کے بعد تارن لوگ جو امریکہ کے ساحل پر بس گئے تھے اُس سرزمین کو چھوڑ کے گرین لینڈ اور آئیس لینڈ چلے آئے۔ اور مالک تاروسے اور ڈنمارک میں واپس چلے آئے۔

لہذا کوئیس پہلا شخص نہیں ہے جس نے امریکہ کو معلوم کیا۔ اس سے پہلے انسان تو وہاں پہنچ ہی چکا تھا۔ اور روس زمین کے ان دو حصوں میں تعلقات منقطع ہو جانے کے بعد بھی بعض لوگ وہاں پہنچ چکے تھے جیسا کہ تارن لوگوں کے حال میں بیان کیا گیا۔ بہت ممکن ہے کہ کوئیس نے یہ قدیم افسانہ سننے پر وہاں اور انھیں کی بنا پر اسے اس یقین کے ساتھ اتنی دور سند میں جانیکی جرات ہوئی ہو۔ اتنا ضرور کہ اگر آپ کچھ معلوم تھیں بھی اُس وقت کی جہاز کا نام عیشیہ یاد رہے گا۔

قسمت کی نیرنگی

اندلس کے آخری اسلامی دور حکومت میں شاہ یوسف بن محمد غرناطہ کے تاج و تخت پر بیٹھا ہوا حکومت کر رہا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام اُس نے خود اپنے نام پر یوسف رکھا۔ منجھلے بیٹے کا نام محمد تھا۔ منجھلے علی اور چھوٹے کا نام احمد تھا۔ بادشاہ یوسف کا منجھلا بیٹا محمد بن یوسف بڑا بہادر اور منجھلا جوان تھا۔ اس میں تیزی اور حوصلہ مندی کے جذبات بھی موجود تھے۔ اس نے دیکھا کہ بڑے بھائی یوسف کو محمد پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور محض بڑے ہونے کی وجہ سے اُسے یہ حق حاصل ہو گیا ہے۔ حالانکہ میں اس سے زیادہ قابل اور بہادر ہوں۔ پھر بادشاہ بھی اسی کو چاہتا ہے اور اسے ولی عہد مقرر کر دیا ہے۔ محمد بن یوسف کی منجھلی طبیعت نے اسے گوارا نہ کیا اور اس نے ارادہ کیا جس طرح ممکن ہو مجھے تاج و تخت حاصل کرنا چاہیے۔

اس جوش میں اُس نے بادشاہ یعنی اپنے باپ کی بھی پروا نہ کی اور مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اندلس میں مسلمانوں کی حالت رو بہ تنزل تھی اور فتنہ و فساد کے لیے صرف بہانہ کافی ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ اُسکے طرفدار ہو گئے۔ شہر کے عوام اور وہ غیر مطمئن لوگ جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر اٹھ کھڑے ہوا کرتے ہیں اس دفعہ بھی شہزادہ محمد کے ساتھ ہو گئے۔ اور یہ بے اطمینانی کی حالت قائم رہی۔ شاہ یوسف نے انتقال کیا جس کا واقعہ بھی عجیب و غریب ہے۔

قاس کے بادشاہ نے شاہ یوسف کے پاس چند قیمتی ہریے بھیجے اور اُن میں ایک نہایت ہی بھاری زرہ بفت کا جوڑا بھی تھا۔ اصل میں قاس کا بادشاہ یوسف سے دشمنی رکھتا تھا۔ لہذا اس جوڑے کو ایک نہایت تیز قسم کے زہر میں تر کر کے خشک کر لیا گیا تھا۔ بادشاہ یوسف نے ایک دفعہ اس جوڑے کو پہنا تو اُسکے سارے جسم میں درد پیدا ہو گیا۔ اور اسی تکلیف سے اس نے اپنی جان دی۔ کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔

شاہ یوسف کے منجھلے بیٹے محمد نے اسی دن کے لیے سازشوں اور مکاریوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ بابا کے مرتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کل شیوخ و امرا اُس کے طرفدار ہو گئے۔ کسی نے شہزادہ یوسف کے حقوق کا لحاظ نہ کیا اور شہزادہ محمد کو زیادہ جست و جال لاک اور بہادر دیکھ کے سب اُسی کی طرفدار ہو گئے۔ اُنھوں نے اسی منجھلے بیٹے کی حکومت کا اعلان کر دیا اور وہ محنت سلطنت پر بیٹھ گیا۔

محمد بن یوسف کو تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ اپنے بڑے بھائی یوسف کو گرفتار کر لے۔ وہ شہزادہ اپنی قسمت پر قانع ہو کے گھر میں خاموش بیٹھ رہا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اس طرح خاموشی اور امن کے ساتھ اپنی زندگی کے دن پورے کر دے۔ اس خیال سے وہ نہ اپنے گھر سے باہر نکلا۔ نہ انقلاب پسند لوگوں سے ملا۔ اور نہ اُنھیں کسی قسم کی ترغیب دی۔ مگر اُس کا چھوٹا بھائی اُسے آزاد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ لہذا اسے گرفتار کر کے قلعہ شلو بانیہ میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کی نہایت سختی کے ساتھ نگرانی رکھی جائے۔ مگر اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے جس چیز کی اُسے ضرورت ہو فوراً مہیا کر دی جائے۔ اس حکم کے مطابق وہ شہزادہ اپنے حرم اور لونڈی غلاموں کے ساتھ اس قلعے میں پونچھا دیا گیا۔

کئی سال اسی حالت میں گزر گئے۔ شاہ محمد بن یوسف غرناطہ پر حکومت کرتا رہا۔ آخر وہ بیمار ہوا اور اُس کا مرض اس حد تک پہنچ گیا کہ طبیبوں نے جواب دیدیا۔ اُنھیں نظر آیا کہ اس بیماری کا نتیجہ سوا موت کے اور کچھ نہ ہو گا۔ خود محمد بن یوسف کو اپنی زندگی کی امید نہیں باقی رہی۔ اُسے یہ خیال کر کے بہت رنج ہوتا کہ میرے بعد میرا بیٹا بھائی تخت و تاج کا مالک ہو گا۔ اور میری اولاد اس سے محروم رہے گی۔ لہذا ارادہ کیا کہ یوسف بن یوسف کو قتل کرانے اس قلعہ شلو بانیہ کے قائد کو ایک خط لکھا اور اپنے معتبر خادم رئیس احمد بن مشرق کے ہاتھ اس کے پاس بھیجا۔ اس

خط میں لکھا تھا۔ میرے وفادار خادم قلعہ شلو بانیہ کے قائد جیسے ہی انھیں
رئیس احمد بن شرق کے ہاتھ سے یہ خط ملے تم پر لازم ہے کہ میرے بھائی
یوسف کو قتل کروالو۔ اور اسی قاصد کے ہاتھ ان کا سر کاٹ کے
میرے پاس بھیج دو۔ دیکھو میری وفاداری میں تم سے کوتاہی نہ ہونے
پائے۔“

رئیس احمد بن شرق یہ خط ملنے کے قلعہ شلو بانیہ میں پہنچا۔ اس وقت
شہزادہ یوسف قلعہ کے قائد کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ شہزادہ یوسف
کے لیے اس کے رتبے کے مطابق ہر قسم کا سامان عیش ہم ہو چکا یا گیا تھا۔
اور اس کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ وہ اس وقت نہایت پر تکلف قالیبون
پر بیٹھے تھے اور کار جوئی تکیے رکھے ہوئے تھے۔ قائد نے بادشاہ کا خط
پڑھا تو اُسے بڑا صدمہ ہوا۔ اور اُس کے چہرے سے رنج و افسوس
ظاہر ہونے لگا۔ جو شخص شہزادہ یوسف سے ملتا اُس کی نیکی اور اعلیٰ صفات
کیوجہ سے اُس کی قدر کرنے لگتا۔ اس قائد کو بھی اس کے ساتھ رہنے
سننے کی وجہ سے بڑی محبت ہو گئی تھی۔ لہذا قائد نے جیسے ہی شاہ محمد
بن یوسف کا خط پڑھا اُس کا دل میٹھ گیا۔

رئیس احمد بن شرق جو یہ خط لایا تھا اس حکم کی تعمیل کرانا چاہتا
تھا۔ اُس نے قائد سے کہا کہ بادشاہ کا یہ حکم بالکل قطعی ہے اور اس کی تعمیل
میں تاخیر نہ کی جائے۔ مگر قائد کا دل اب بھی اس بات کو کسی طرح نہیں
گوارا کرتا تھا کہ ایسے ظالمانہ اور برسرِ حمی کے حکم کو شہزادہ یوسف کے کانون
مک پہنچائے۔ لہذا وہ خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ شہزادہ یوسف
ان باتوں سے سمجھ گیا۔ اور قائد کے چہرے کی پریشانی اور اضطراب دیکھ کے
اُس نے پوچھا کہ کیا بادشاہ نے میرے قتل کا حکم دیا ہے۔ جو آپ اس قدر
پریشان نظر آتے ہیں؟ قائد نے زبان سے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بادشاہ
کا خط شہزادے کے ہاتھ میں دے دیا۔ اسے پڑھ کے شہزادہ یوسف نے کہا
”اچھا مجھے چند گھنٹوں کی اجازت دیجیے تاکہ اپنے خاندان والوں سے رخصت

ہو لوں۔ اور اپنے پس ماندوں کو آخری مرتبہ اپنے ہاتھ سے ہیے دیوں گا۔
مگر احمد بن شرقی نے جواب دیا کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں ذرا ہی بھی دیر
نہیں کی جا سکتی۔ یہ اوقات مقرر کر دیا گیا۔ میرے یہاں تک آئے اور واپس جا
کا پورا حساب لگا کے مجھے بتا دیا گیا ہے کہ فلاں وقت تک واپس پہنچ جانا
چاہیے۔ شہزادے نے کہا خیر تو ہمیں یہ بازی تو ختم کر لینے دو۔ مگر یقین ہے
کہ اب میں ہی ہاروں گا۔ کھیل پھر شروع ہوا مگر قائد کا دل اس قدر متاثر
ہو گیا تھا کہ وہ کوئی مہر بغیر غلطی کیے نہ چل سکتا۔ اور شہزادے نے کئی دفعہ
اُسے توجہ دلائی۔

اب خدا کی قدرت اور قسمت کی نیرنگی دیکھیے کہ وہ بازی ابھی
ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دو شہسوار اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے غرناطہ کی
جانب سے آئے۔ اور شاہ تھمیر بن یوسف کے انتقال کی خبر دی۔ شہزادہ یوسف
کو اپنی بد قسمتی کی بدولت ابھی اس کا یقین نہ آتا کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔
مگر تھوڑی دیر میں دیگر سوزنیں اور امرا بھی آ پہنچے۔ اور انھوں نے بھی اس
خبر کی تصدیق کی جو پہلے دونوں شہسواروں نے پہنچائی تھی۔ اس کے بعد سب
لوگ بیان سے خوشی خوشی نکلے اور نہایت تیزی کے ساتھ دار السلطنت کی
جانب چلے۔ غرناطہ میں یوسف کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ استقبال
ہوا اور وہ تخت سلطنت پر بٹھادیا گیا۔

پیداری

از خباب مولوی غلام طیب صاحب بی اے بی ٹی
مددگار عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن

کل نہ تھا یہ درد دل میں اور یہ الجھن نہ تھی مجھ کو تڑپائی کسی کی بوسے پیراہن نہ تھی
شمع کے جلنے پہ میں آتش بجان ہوتا نہ تھا رقص پروانہ پہ دل کا امتحان ہوتا نہ تھا
یہ نہ آوارہ خیالی تھی نہ آوارہ فطرس قلب تھا نا آشنائے مخاطب بال و پر

رات کی ٹھنڈی ہواؤں میں مجھے آتی تھی پسند
صبح دم جب آج جڑیاں آشیانوں کو اٹھیں
صبح نے ہر سمت چھیرا جبکہ سارے سردی
آسمان پر جبکہ شب بیدار تارے سو گئے
جب دعاؤں کے لیے باب اجابت کھل گیا
صبح سے جب رات بل بل کر جدا ہونے لگی
سنہرے خوابیدہ جب مستی میں اہلے لگا
جبکہ فطرے اوس کے آنکھوں میں گھر کرنے لگے
ایک صورت کی طرف کھینچنے لگی سیری نینر
میرے دل میں کیا ایک کچھ گدگدی ہونے لگی
سارے پردے اٹھ گئے منظر نظر آنے لگے
جو شجر خاموش تھے اب گفتگو کرنے لگے
بند دل کے کھل گئے چستے نئے بننے لگے

عشق تو نے اک نظر میں کیا تماشا کر دیا
دل کو صحرانکر دیا آنکھوں میں دریا بھر دیا

قدر دانان و گلہ از

دگلہ از کی اشاعت میں اس مرتبہ غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے۔ لیکن آئندہ کے لیے اہتمام کر لیا گیا ہے کہ رسالہ وقت پر شائع ہوا کرے۔ ان رسالوں کے پونچنے کے بعد انشاء اللہ بقیہ رسائل بھی جلد ہی پونچ جائیں گے۔ اور کوشش کی جائے گی کہ دسمبر کا پرچہ اپنے وقت پر شائع ہو۔

خاکسار حکیم سراج الحق رینجر و گلہ از



عربوں کے زمانہ حکومت اسپین میں جن لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا ان میں ایک زریاب بھی ہیں۔ ان کا پورا نام ابوالحسن علی بن نافع تھا۔ اور لقب زریاب تھا۔ مگر یہ لقب اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ اصلی نام بھول گئے۔ سب اسی لقب سے انہیں یاد کرتے تھے۔

زریاب دراصل بغداد کے رہنے والے اور ایرانی نسل سے تھے۔ انھوں نے موسیقی میں بڑا نام پیدا کیا جس کی تعلیم انھوں نے ہارون رشید کے دربار کے مشہور مغنی ابوالحسن موصلی سے پائی تھی جو اپنے زمانے کے بالکل استاد تھے۔ آخر میں زریاب اپنے استاد سے بھی بڑھ گئے۔ اور ان سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ زریاب فقط موسیقی کے ماہر نہ تھے بلکہ ہر قسم کے علوم و فنون میں انہیں کافی دستگاہ حاصل تھی۔ اور ان کی قابلیت مسلم تھی۔ مگر موسیقی میں خاص کر انہیں کمال حاصل تھا۔

ایک دن ہارون رشید نے اسختی سے کہا کہ کسی نے شخص کا گانا سناؤ اسختی نے عرض کیا کہ میرا ایک شاگرد ہے جو بہت اچھا گانے لگا ہے۔ اور میں نے اس کے ساتھ جو محنت کی ہے بیکار نہیں گئی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرا نام روشن کرے گا۔ رشید نے حکم دیا کہ اسے فوراً حاضر کرو۔ زریاب شاہی دربار میں پہنچے اور ایسے سحر آفرین انداز میں گائے کہ خلیفہ حیران رہ گیا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ تم موسیقی جانتے ہو؟ زریاب نے جواب دیا کہ میں معمولی گانا بھی جانتا ہوں مگر اس کے ماسوا

مجھ میں ایک ایسا کمال موسیقی بھی موجود ہے جس سے اور سب لوگ نادان
ہیں۔ اور وہ محض آپ کے ایسے قدر و انان فن کے کانون کے لیے مخصوص ہے
آپ کہیں تو میں اُسی طرح گاؤں جس طرح اور سب لوگ گاتے ہیں ورنہ
اس خاص طریقے سے گاؤں جسے اب تک کسی کے کانون نے نہیں سنا ہے۔
خلیفہ نے حکم دیا کہ ابو اسحق کا سرود تر یا ب کو دیا جائے۔ مگر تر یا ب
نے کہا کہ میں خاص اپنے سرود پر گانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ خلیفہ نے تعجب سے
پوچھا کہ تم اپنے استاد کے سرود کو بھی نہیں پسند کرتے؟ تر یا ب نے عرض کیا
کہ اگر آپ میرے استاد کا ایسا گانا سنا جائے تو میں استاد ہی کے سرود
پر گاؤں۔ لیکن اگر آپ خاص یہ گانا سنا چاہتے ہیں تو مجھے اپنے ہی سرود
پر گانے کی اجازت دیں۔ خلیفہ نے تر یا ب کا سرود لے کر دیکھا اور کہا کہ
یہ بھی اسحق کا سرود ہے۔ تر یا ب نے کہا کہ بظاہر دونوں ایک ہی جیسے
ہیں مگر میرا سرود اول تو بہت ہلکا ہے دوسرے اُس کے تار ریشم کے ہیں
جو خاص طور پر بنائے گئے ہیں پھر اس میں کئی اور باتیں بھی ہیں۔ سرود
میں عام طور پر چار تار ہوا کرتے ہیں میں نے ایک تار اور بڑھا دیا ہے
جس سے بڑا فائدہ ہو گیا ہے۔ اور نگرہ کی کھونٹوں کے بجائے عقاب
کے نیچے لگائے ہیں جس سے آواز بہت بلند اور صاف نکلتی ہے۔ اس کے
بعد تر یا ب نے گانا شروع کیا۔ یہ خلیفہ ہارون رشید کی شان میں ایک
قصیدہ تھا۔ خلیفہ نے سنا تو واقعی اُس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔
اس کی روح وجد میں آنے لگی۔ اور وہ بے اختیار ہو گیا۔ گانا ختم ہونے
کے بعد خلیفہ نے اسحق سے کہا کہ تم نے ایسے باکمال شخص کو اب تک میرے
سامنے کیوں نہ پیش کیا۔ اسحق نے کہا حضور اب تک میں خود ان کے اس
غیر معمولی کمال سے بے بہرہ تھا۔ اور اسحق نے یہ بالکل سچ کہا کیونکہ تر یا ب
نے اپنا یہ جو ہر ذاتی اب تک اسحق سے پوشیدہ رکھا تھا۔

مگر اسی وقت اسحق کے دل میں حسد کی آگ روشن ہو گئی اور
گھر پہنچتے ہی تر یا ب سے کہا کہ تم نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ اپنے غیر معمولی

ہنر کو مجھ سے چھپائے رکھا۔ اور اس وقت جبکہ خود میں نے تمھیں بارگاہ خلافت میں لے جا کر پیش کیا تو اس کمال کو ظاہر کر کے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ میں تم سے صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ مجھے تم پر حسد آتا ہے کیونکہ میرا پیشہ وہی ہے جو تمھارا ہو گا۔ اور میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اس فن میں کوئی مجھ سے زیادہ عزت اور نام پیدا کرے خواہ وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اب خلیفہ کو تمھارا گانا پسند آگیا ہے۔ اور تم بیان رہے تو خلیفہ کی ساری عنایتیں تمھاری جانب مبذول ہو جائیں گی اور میں کس میرسی کے عالم میں پڑا رہوں گا۔ میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ اسی وقت تم کو قتل کر ڈالوں مگر تم میرے شاگرد ہو لہذا رحم آ جاتا ہے۔ اب سن لو اور اپنے لیے ان دو صورتوں میں سے کوئی بات اختیار کر لو۔ ایک تو یہ کہ اسی وقت بغداد سے روانہ ہو جاؤ اور کسی دور دور از ملک کا راستہ اختیار کر دو۔ اور اس کی قسم کھاؤ کہ پھر کبھی بیان نہ آؤ گے۔ اس صورت میں میں تمھیں ضروری سامان اور کچھ روپیہ فراہم کر دوں گا۔ دوسری صورت تمھارے بیان ٹھہرنے کی ہے تو یہ جان لو کہ میں تمھارا سخت ترین دشمن بن رہا ہوں گا اور تمھیں تباہ و برباد کر کے قتل کر دینے میں بھی دریغ نہ کروں گا خواہ اس کا نتیجہ بعد میں کچھ ہی ہو۔ اب تم ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اسی وقت اختیار کر لو۔

ترریاب نے فوراً اسے قائم کر لی اور اپنے لیے پہلی صورت پسند کی۔ اسٹیج سے ضروری سامان سفر لیا۔ اور بغداد سے چل پڑا ہوا۔

چند روز بعد خلیفہ ہارون رشید نے پھر ترریاب کو یاد کیا۔ اور اسٹیج سے کہا کہ اپنے اسی شاگرد کو بلاؤ۔ اسٹیج نے جواب دیا کہ حضور وہ شخص تو اس قابل نہیں کہ شاہی دربار میں بلایا جائے۔ وہ تو مجنون ہو گیا ہے۔ کہتا ہے کہ رات کو مجھے جنات آکے گانا سکھایا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اس قدر مغرور ہو گیا ہے کہ دنیا میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا حضور نے اس دن بلا کے اُسے گانا سنا تھا مگر اسے نہ انعام دیا اور نہ اُس کی عزت افزائی فرمائی اس پر وہ ناراض ہو کر کہیں چلا گیا۔ اب نہیں معلوم

کہاں ہے۔ مگر میں تو خدا کا شکر کرتا ہوں کہ حضور کو اس دیوانے شخص سے نجات مل گئی۔ بعض اوقات جب اُس پر دیوانگی کا دورہ ہوتا ہے تو اس کی صورت بڑی خوفناک ہو جاتی ہے۔ اور دیکھ کے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ یہ سن کر خلیفہ کو اس نوجوان مغنی کے چلے جانے کا بڑا افسوس ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ شخص استغنیٰ سے بھی زیادہ باکمال مغنی ہو گا۔

اصل یہ ہے کہ جو کچھ استغنیٰ نے خلیفہ کے روبرو بیان کیا تھا اس کی اہمیت ضرور رکھتی ہے۔ زریاب یہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں سوتے میں جنون کے گیت سنا کرتا ہوں اور رات کو جن آکر مجھے ایک نئی دھن سکھا جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ سوتے سوتے چونک پڑتے۔ بستر پر اٹھ کے بیٹھ جاتے اور اپنی لونڈیوں غزالہ اور ہندہ کو پکارتے۔ ان سے کہتے کہ اپنے سروں کو لاؤ پھر اُنھیں وہی نغمہ سکھا دیتے جو سوتے میں سنا تھا۔ اور ان اشعار کو لکھ لیتے۔ اور سو جاتے۔ استغنیٰ بہ خوبی جانتے تھے کہ ان کی یہ حرکت دیوانگی پر مبنی نہ تھی۔ ہر سچے ہنرمند کو خواہ وہ اجنبہ کا قائل ہو یا نہ ہو بعض ایسے لمحات ضرور پیش آتے ہیں جب کہ وہ غیر معمولی اور ناقابل بیان جذبات کے تابع ہو گیا ہے۔ اور اُس کی تشریح خود اس کے اختیار میں بھی نہیں رہی ہے۔ اور یہ ایک مافوق العادات چیز ہوتی ہے خود استغنیٰ الموصلی کی نسبت یہ مشہور ہے کہ ان کا مخصوص نغمہ اُنھیں کسی جن نے آ کے سکھایا تھا۔

زریاب ارض مغرب کی جانب چلے۔ افریقہ میں پہونچ کر اُنھوں نے اسپین کے بادشاہ الحکم کو لکھا اور اس کے دربار میں حاضر ہو کر وہیں قیام کرنے کی اجازت چاہی۔ زریاب کی شہرت ارض مغرب اور اسپین میں پہونچ چکی تھی۔ اسپین کے مسلمان اب وہ سادے مزاج عرب نہیں رہے تھے۔ جنھوں نے آتے ہی ایک محلے میں سارے اسپین کو فتح کر لیا تھا۔ اب ان میں دولت مند کی ساتھ عیش و عشرت کی خواہشیں بھی پیدا ہو چکی تھیں۔ الحکم نے جب زریاب کا یہ خط پایا تو بہت خوش ہوا۔ اُس نے زریاب کو لکھا کہ آپ فوراً افریقہ میں آجائیے۔ اور ہمیں رہیے۔ میں آپ کے رہنے

سننے کا مناسب بندوبست کر دیا گیا۔

ترریاب اپنے بال بچوں کو لے کر افریقہ سے روانہ ہوئے۔ اور آبنائے جبرالٹر کو پار کر کے اسپین میں داخل ہوئے۔ الجزائرہ میں جہاں سے اترتے ہی انھیں معلوم ہوا کہ شاہ الحکم کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر سے انھیں بڑی مایوسی ہوئی اور ارادہ کیا کہ افریقہ میں واپس چلے جائیں۔ الحکم نے اپنے دربار کے یہودی مطرب منصور کو ترریاب کے استقبال کے لیے الجزائرہ میں بھیج دیا تھا۔ وہ ترریاب سے ملا۔ انھیں واپس جانے سے روکا اور یقین دلایا کہ الحکم مرحوم کا بیٹا اور جانشین عبدالرحمن بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کا شائق اور قدردان ہے۔ قرطبہ پہنچتے ہی وہ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لے گا اور آپ کو خوش رکھے گا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ منصور کا خیال صحیح تھا۔ عبدالرحمن کو ترریاب کے آنے کی خبر ہوئی تو بڑے شوق کے ساتھ اپنے دربار میں بلا بھیجا۔ الجزائرہ سے قرطبہ تک راستے کے کل قائدون کو حکم دیدیا کہ ترریاب کی ضرورتوں اور آرام و آسائش کا خیال رکھیں اور عزت و توقیر کے ساتھ قرطبہ تک پہنچا دیں۔ پھر دوبار کے ایک خواجہ سرا کے ہاتھ بہت سے تحفے اور خیرادے سواریان بھیج دیں تاکہ کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔

قرطبہ میں پہنچ کر ترریاب ایک عالیشان محل میں ٹھہرائے گئے جہاں ضرورت اور آسائش کی تمام چیزیں پہلے سے مہیا کر دی گئی تھیں۔ عبدالرحمن نے تین روزہ انھیں آرام کرنے دیا تاکہ سفر کا تھکان دور ہو جائے۔ اس کے بعد چوتھے روزہ اپنے محل میں بلایا۔ بادشاہ نے سب سے پہلے ترریاب کو شاہی خلعت سے سرفراز کیا پھر بتایا کہ یہاں آپ کو ماہانہ دو سو اشرفیان ملا کر دیں گی۔ اس کے علاوہ سس سال میں چار انعام ملین گے۔ دونوں عیدوں کے موقعوں پر ایک ایک ہزار اشرفیان دی جائیں گی اور موسم بہار کے آغاز پر پانچ سو اور نوروز میں پانچ سو اشرفیان یا سالانہ دو سو من جو ایک سو من گھبران بھی بادشاہ کی طرف سے

دیے جائیں گے۔ کئی عالیشان محل اور فرحت بخش باغ بھی ترریاب کو دیے گئے۔

بادشاہ عبدالرحمن کو جب اس کا اطمینان ہو گیا کہ ترریاب خوش ہیں اور اپنے بود و باش کی طرف سے بے فکر ہیں تو ایک روز انھیں شاہی محل میں بلا کر گانا سنا۔ اس محفل طرب میں ترریاب کی جادو بھری آواز نے بادشاہ کو مسحور و اندوختہ کر دیا۔ اُس کے دل و دماغ پر ایسا اثر پڑا کہ اس کے بعد اُسے کسی کا گناہ پسند نہ آتا۔ اسی دن سے عبدالرحمن کو ترریاب کے ساتھ جیسا انس ہو گیا ترریاب فقط مغنی ہی نہ تھے بلکہ جملہ علوم میں اچھی قابلیت رکھتے تھے زندہ ولی اور ذہانت و طباعی اور فراست و دانائی میں اُن کا ثانی نہ تھا۔ مذاق ایسا پاکیزہ اور سنجیدہ پایا تھا کہ تھوڑے ہی زمانے میں تمام شائستہ صحبتیں اُن کی دلدادہ ہو گئیں۔ علم ادب لطیف معاشرت ادب مجلس جادو بیانی اور شاہی خدمات کی انجام دہی میں وہ استاد مانے جاتے تھے۔ علم ہیئت اور جغرافیہ کی اُنھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اقلیموں کی تقسیم ممالک کے اختلافات ہر ہر جگہ کی آب و ہوا اور دریاؤں کے حالات اور مختلف ممالک کے باشندوں کی خصوصیتیں سب انھیں بخوبی علوم تھیں۔ شاہ عبدالرحمن ان کی بڑی قدر کرنے لگا۔ تاریخ و سر شعر و سخن اور دیگر علوم و فنون کے متعلق ان سے بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتا۔ ترریاب کو وہ اکثر اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا کے کھانا کھلاتا اور کبھی اپنے بیٹوں کے ساتھ کھانے کی اجازت دیتا۔ آخر میں بادشاہ کو ترریاب کے ساتھ اتنی خصوصیت ہو گئی کہ شاہی محل کا ایک دروازہ ترریاب کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور بادشاہ جب چاہتا اسی راستے ترریاب کو فوراً اپنے پاس بلا لیتا۔

موسیقی میں ترریاب کے کمال کی یہ حالت تھی کہ جو کوئی اُن کا نغمہ دلکش ایک دفعہ سن لیتا زندگی بھر کے لیے اس کی تمنا رہ جاتی۔

دس ہزار نمون کی دھنیں اور ان سب کے اشعار اُنھیں زبانی یاد تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ مگر جس چیز نے اُن کے وسیع علم میں جان ڈال دی تھی وہ اُن کی فراست اور مذاق سلیم تھا جس صحبت میں وہ آ جاتے اس کا رنگ دفعہ بدل جاتا۔ بذلہ بنی اور مذاق کی باتوں میں کوئی ان کی برابری نہ کر سکتا۔ کسی نکمری صحبت میں کسی شخص کی گفتگو ان سے زیادہ دلچسپ اور معنی خیز ہوتی۔ بحسن و جمال کی قدراتی میں کوئی ان سے زیادہ صحیح رہ نہ قائم کر سکتا۔ لباس کے معاملے میں اُن سے زیادہ خوش وضع اور کوئی نہ نظر آتا۔ کوئی شخص دعوت یا تقریب کے انتظامات کو ان سے زیادہ کامیابی اور سلیقہ کے ساتھ نہ انجام دے سکتا۔ اندلس کی معاشرت میں زریاب نے بڑا اثر ڈالا۔ اُنھوں نے وہاں بہت سی نئی نئی باتیں پیدا کر دیں جن کا اس سے پہلے لوگوں کو خیال بھی نہ تھا اس معاملے میں اندلس کے باشندے یہاں تک کہ بادشاہ ارکان سلطنت اور امرا بھی زریاب کو اپنا رہبر سمجھنے لگے۔ اور ذوق و شوق کے ساتھ اُن کی تقلید کرتے۔

زریاب کے اندلس میں آنے سے پہلے لوگ لمبے بال رکھتے تھے اور بیچ سر میں مانگ نکالا کرتے۔ امرا کے یہاں سوئے کے برتنوں میں کھانا کھایا جاتا تھا۔ اب لوگوں نے زریاب کی تقلید میں چھوٹے چھوٹے بال رکھنے شروع کیے اور ٹیڑھی مانگ نکائی اور یہ وضع اندلس ہی سے سارے یورپ میں پھیلی۔ چاندی سوئے کے برتنوں کے بجائے زریاب نے شیشے کے برتنوں میں کھانا پینا شروع کیا جو ان سے زیادہ خوش نما پر تکلف اور اس کے ساتھ ہی پاک و صاف رہتے اس سے پہلے لوگ لکڑی کی سادی میز یا چوکی پر کھانا رکھ رکھتے تھے زریاب نے میز کے اوپر ایک چمڑے کا دسترخوان بچھایا جو آسانی سے صاف کیا جا سکتا ہے اور میز بھی میلی نہ ہوتی۔ یہ سب چیزیں اندلس سے رائج ہو کر سارے یورپ میں پھیل گئیں۔

تریاب نے اندلس والوں کو یہ بھی بتایا کہ موسمی تغیرات
 کے ساتھ اپنے لباس بدل ڈالا کریں۔ اس سے پہلے لوگ صرف
 تین مہینے گرمیوں کے سادے کپڑے پہنتے تھے اور باقی نو مہینے
 جاڑوں کے کپڑے پہنتے رہتے۔ تریاب نے بتایا کہ جاڑوں اور
 گرمیوں کے درمیان میں جو فصل ہوتی ہے اُس میں پہنے رنگ
 کے خز۔ ململ۔ اور ریشمی کپڑے پہنتے چاہیں تاکہ مسلسل نو مہینے تک
 ایک ہی قسم کے کپڑے پہنتے رہتے۔ طبیعت نہ بگڑ جائے۔
 اس سے پہلے بادشاہ اور امرا خوشبو کے لیے گلاب
 اور دیگر اقسام کے پھول بسوا کے اپنے کپڑوں پر چھڑک لیتے تھے۔
 اس میں ہزار احتیاط کی جاتی مگر پھر بھی کپڑوں میں دھبے پڑ جاتے
 اور کپڑے میلے ہو جاتے۔ تریاب نے اپنی ذہانت سے خوشبو
 بھولوں کا عرق نکال کے اس کا ایک سفوف تیار کر لیا۔ اس کے
 لگانے سے کپڑے ویسے ہی پاک و صاف رہتے اور خوشبو بھی
 پیدا ہو جاتی۔ یہ ترکیب سب کو بہت پسند آئی اور اب تک یورپ
 میں بھولوں کے عرق یا سفوف کا رواج چلا آتا ہے۔
 تریاب نے اہل آندلس کو بہت سی ترکاریاں بھی بتائیں
 جو وہاں بہ کثرت پیدا ہوتی تھیں مگر کوئی اُن کا استعمال نہ جانتا تھا
 کئی قسم کے کھانے بھی تریاب کی طرف منسوب ہیں اور اب تک یورپ
 میں بڑی بڑی تکلف نعمتیں سمجھی جاتی ہیں۔ غرض تریاب نے آندلس والوں
 ہی کو نہیں بلکہ پورے یورپ کو بود و باش کھانے پینے اور رسلنے
 جلنے کی بہت سی جزئی باتیں بتائیں۔ اور اُن میں رائج کردین اور
 وہ اس قدر دل آویز تھیں کہ سب انھیں پسند کرتے اور فوراً اختیار
 کر لیتے۔ اسپین میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی تریاب کا نام
 بھی مشہور ماہرین فن۔ شاعر و نہاد۔ سپہ سالار و ن۔ مدبر و نیر و ن
 اور کامیاب حکمرانوں کے ساتھ لیا جاتا رہا۔

زیریاب کو عبدالرحمن کے دربار میں اس قدر رسوخ حاصل ہو گیا
 تھا اور عبدالرحمن اُن پر اتنا مہربان تھا کہ لوگ اپنی عرضیاں لے کر اُن کے
 پاس آتے کہ وہ اپنی سفارش کے ساتھ بادشاہ تک پہنچا دیں۔ زیریاب
 حتیٰ الامکان لوگوں کے کام کال دیا کرتے۔ مگر انھوں نے کبھی اس کی سلطنت
 میں دخل نہیں دیا۔ وہ جانتے تھے کہ ان معاملات میں پڑنے سے سازش کا
 دروازہ کھل جائے گا۔ اور اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔
 زیریاب کی وجہ سے آندلس میں لوگوں کو موسیقی کا شوق پیدا ہوا اور
 یہ عام طوم پر سارے یورپ میں مشہور تھا کہ اہل آندلس خوش پوش پاک و صاف
 رہنے والے اور سب سے زیادہ کھیل اور گانے بجانے کے مشتاق ہیں۔
 آندلس میں جب کوئی شخص کسی استاد کے پاس گانا سیکھنے جاتا تو اس
 اُس سے کوئی شعر پڑھوا تا خواہ وہ کسی دھن میں ادا کرے۔ اس کے بعد اسے
 آواز میں لایج پیدا کرنا بتایا جاتا۔ یہ طریقہ موسیقی کے استادوں نے زیریاب
 ہی سے لیا تھا کیونکہ انھیں نے سب سے پہلے اسے رائج کیا۔ زیریاب کا یہ قاعدہ
 تھا کہ جو کوئی اُن سے گانا سیکھنے آتا اسے ایک قالین پر بیٹھا دیتے اور بلند
 آواز میں اُس سے چند شعر پڑھواتے۔ جب اس بات کا اطمینان ہو جاتا کہ آواز
 کافی بلند ہے تو گانے کے اصول اسے بتاتے۔ لیکن اُس شخص کی آواز اگر کمزور
 ہوتی تو اُس سے کہتے کہ اپنا عمامہ سر سے اتار کے پیٹ کے گرد کس کے پیٹ
 اس سے اُس کی آواز اونچی ہو جاتی اور سانس بھی نہ پھولتی۔ اگر کسی شخص
 کا مومنہ پورا نہ کھلتا تو اس سے کہتے کہ تین انگلی چوڑا لکڑی کا ایک ٹکڑا مومنہ
 میں رکھ کے سو رہو۔ اس ترکیب سے اُس کا مومنہ کھلنے لگتا۔ ان ابتدائی تجاویز
 کے بعد اگر وہ دیکھتے کہ یہ شخص موسیقی کی تعلیم کے قابل ہے تو اسے اس کے اصول بتانا
 شروع کرتے اور اس سے مشق کراتے۔ ورنہ اسے صاف جواب دینے کہ آپ
 موسیقی کے پھر میں نہ پڑیے۔ کسی اور جانب تو جہ کیجیے۔
 زیریاب کے آٹھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اُن کے بیٹوں میں
 عبدالرحمن بعید اللہ اور قاسم نے موسیقی میں بڑی مہارت حاصل کی۔ زیریاب

کی بیٹی محمد نہ وزیر ہشام بن عبدالعزیز کو بیاہی گئی۔ اور اُس نے بہت بڑی عمر پائی۔ عالم لوگوں اور محتاجوں کی وہ بہت مدد کرتی تھی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو لوگوں کو بہت صدمہ ہوا۔

قدیم تمدن ایران

(از جناب لطافت حسین صاحب)

ایران کی طبیعی خصوصیات

حدود ایران براعظم ایشیا کا وہ خطہ مرقع ہے جس کے شمال میں کوہ آلبرز جنوب میں بحر ہند مشرق میں کوہ ہندو کش اور آندس کی وادیاں ہیں۔ مغرب میں دجلہ۔ خلیج فارس پشت کوہ دور آراءت کی پہاڑیاں ہیں۔ ان حدود میں بہت کچھ حصہ افغانستان اور تاجکستان کا بھی آگیا ہے۔

صوبہ حیات مشہور قدیم صوبوں میں عراق، عجم، آذربائیجان، طہران، (قدیم سلطنت میدیہ) فارس، (قدیم سلطنت فارس) عربستان و خوزستان و آستان (قدیم سلطنت ارم) اور کرمان (قدیم کرینیا) ہیں۔ گیلان و آذربائیجان جو بحر خضر کے قریب واقع ہیں ایران کی قدرتی سرحد کے باہر ہیں مگر پولیٹیکل حیثیت سے ہمیشہ اسی میں شامل سمجھے گئے ہیں۔

پہاڑیاں یہ ملک نہ صرف چاروں طرف پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا ہے بلکہ جگہ جگہ اندرونی حصے میں بھی وہ متوازی یعنی ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلے گئے ہیں اور ان کی بعض وادیاں بس سیلی تک چوڑی ہیں۔ شمالی سلسلے میں سب سے بڑے پہاڑ ہندو کش اور آلبرز ہیں جن کی سلسلے کی مشہور چوٹیاں

۱) میدیہ یعنی عراق عجم (۲) میدیہ آذربائیجان (۳) میدیہ رغان یعنی نزد طہران۔ عجم فارس یا پارسا۔ قدیم دریائے سندھ قدیم ہر کے نام سے بحر کسپین یا بحر گیلان۔

کوہ ہزار اور کوہ لالہ زار اور ہمدان کے قریب کوہ آلوئند ہیں۔
ریگستان | اس سرزمین کے وسط میں ایک عظیم الشان ریگستان ہے جسے
 اس کا قلب مروہ کہنا چاہیے۔ اسے آٹھ کتے ہیں یہاں زبردست آندھیاں
 چلتی ہیں اور گرمی اور سردی دونوں شدت سے ہوتی ہیں۔ اس کے کناروں
 پر بعض مشہور شہر آباد ہیں مثلاً طہران اور مشهد شمال میں۔ تیزد اور کرمان جنوب
 میں۔

سمندر | جنوب اور جنوب و مغرب میں خلیج فارس ہے جہاں سے دنیا میں
 جہاز رانی کی ابتدا ہوئی۔ اور سب سے قدیم تمدن اسی کے ساحل پر قائم ہوا۔
 شمال میں بحر خضہ ہے۔ سکندر کے زمانے میں اس سمندر کی سطح موجودہ سطح
 سے ڈیڑھ سو فٹ زیادہ اونچی تھی۔

جھیل | ملک میں متعدد جھیلیں ہیں جن میں سب سے بڑی آرمیا ہے جس کا
 پانی کھاری ہے جھیل و آن اور گونج بھی مشہور ہیں۔

دریا | اس ملک میں دریا بہت کم ہیں۔ اور کوئی بہت بڑا نہیں۔ تمام
 ایران میں سوا قارون کے اور کوئی دریا جہان رانی کے قابل نہیں۔
 زندہ رود قارون کے قریب سڑک لگتا ہے اور صوبہ اصفہان کو سیلاب کرتا ہوا ایک دلدل میں
 غائب ہو جاتا ہے شمال میں کوہ آذرارک کے قریب دریائے ارس نکلتا ہے مشرق میں کزل عزم ایران
 کا سب سے زیادہ لمبا دریا ہے جو بحر خضر میں گرتا ہے مشرق میں ایلا دریا۔ تاجن بھی ہے۔

ان کے علاوہ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی ندیاں ہیں جو تھوڑی دور
 چلنے کے بعد ریگستان میں پونج کر سوکھ جاتی ہیں۔ اور سوا موسم بہار کے
 اور کسی زمانے میں نہیں نظر آتی ہیں۔ مختلف مقامات میں تالے بھی ملتے ہیں۔
 گرگن کا پانی کھاری ہوتا ہے۔ دریا سے عمان ایران سے دور ہے مگر
 کسی زمانے میں وہی دریا ایران کی مشرقی سرحد مانا جاتا تھا۔ یہاں سے

عہ قدیم ایران تیز۔ عہ اخیر آندھیوں کے سبب سے شاید ایران میں زمانہ
 قدیم سے ہوا کی چکیوں کا رواج چلا آتا ہے۔

بھل کے بحر آرل میں گرتا ہے سکندر کے زمانے تک وہ بحر خضرین کہلاتا تھا۔
نہر خیزی | گیلان اور آذربائیجان نہایت سرسبز اور شاداب ہیں
 آذربائیجان بھی کسی قدر غنیمت ہے۔ عربستان میں بھی خلیج فارس کے
 قریب بکثرت نخلستان (کھجورون کے جھنڈ) موجود ہیں۔ مگر عراق عجم
 خوزستان۔ اور فارس میں بہ اشتناے چند وادیوں کے زراعت
 بہت کم ہوتی ہے۔ مشرقی حصہ جس میں خراسان بھی شامل ہے اکثر بنجر
 ریگستان اور بیابانوں میں کہیں سبزے کا پتہ نہیں۔ اکثر محققین کا خیال
 ہے کہ یہ تمام مرقع خطہ ایران روز بروز زیادہ خشک ہوتا جاتا
 ہے۔ اور جسے دور یا سوکھ رہے ہیں یا غائب ہوتے جاتے ہیں۔
آب و ہوا | اس ملک کی آب و ہوا میں بھی حد درجہ اختلاف ہے۔
 ہاڑیان بہت سرد ہیں۔ کوہ البرز کی چوٹی دماوند چوبیس ہزار فٹ اونچی
 ہے۔ اکثر برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ بہ خلاف اسکے دوسرے حصے بہت گرم و خشک
 ہیں۔ آذربائیجان اور گیلان کی آب و ہوا مرطوب ہے۔ گرمی کے موسم میں راتیں ہوا
 خشک ہوتی ہیں۔ سردی کا زمانہ نہایت خوشگوار اور صحت بخش ہے۔
آبادی | اس ملک کی آبادی زمانہ قدیم میں ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ
 تھی۔ مگر آج کل صرف ایک کروڑ رہ گئی ہے۔ اس میں گیارہ ہزار مجوسی ہیں
 نولاکھ سنی اور باقی سب شیعہ ہیں۔

شاہراہیں | سب سے قدیم وہ شاہراہ ہے جو بابل سے شروع
 ہو کر پشت کوہ کی وادیوں میں سے ہوتی ہوئی کرمان شاہ اور ہمدان
 تک جاتی ہے دوسری چٹا منشی زمانے کی یادگار سارولیس سے ہمدان
 تک اور وہاں سے ترے اور باختر تک جاتی ہے۔ مغربی دنیا اور ایشیا
 کی یہی سب سے بڑی شاہراہ تھی اور اسی پر سکندر نے دارا کا تعاقب
 کیا تھا۔ ایران میں عمدہ ٹرکین بہت کم ہیں۔ سب سے زیادہ آسان
 شمال مغربی راستہ ہے جہاں ترازند اور طفل سے مختلف ٹرکین تیریز میں آکر مل جاتی ہیں۔
بنامات | اسوا آذربائیجان اور گیلان کے جہاں ٹرے ٹرے گھنے

جنگلی اور چراگا ہن ہن اور خلیج فارس کے ساحل کے قریب جہاں کثرت سے نخلستان ہن باقی ہر جگہ نباتات اور پیداوار کی قلت ہے۔ بہاڑیان بے گیارہ خشک ہن۔ فقط ان مقامات پر کچھ سبزہ نظر آتا ہے جہاں دریا ہن۔ درختوں میں بید۔ بید مجنون۔ چنار۔ آجروٹ۔ شاہ بلوط وغیرہ ہن۔ صنوبر اور سرو بہت کم ہن۔ پھولوں میں لالہ۔ چمپلی۔ گلاب۔ اور گل محمودین۔ پھولوں میں حبیب۔ نازنگی۔ شرو۔ آسپاتی۔ تفرجل۔ ہیر۔ آلو بخارا۔ انگور۔ کھجور۔ شہتوت۔ انجیر۔ انار۔ کیتہ۔ بادام۔ خربوزے۔ وغیرہ ہن۔ دنیا میں سب سے پہلی انگور کی کاشت نازندران میں ہوئی اور کیتہ۔ بادام مختلف پھول پھل اور لوسرن وغیرہ ایران ہی سے یورپ۔ چین اور ہندوستان میں گئے۔ ترکاریوں میں گو بھی بیگن۔ گڑی۔ توتلی۔ پالک وغیرہ بہت عام ہن۔ انار۔ مین گھون۔ چاول۔ باجرا۔ جوار اور سرہن۔ اور دیگر اشیاء پیداوار میں تباکو۔ آفیون۔ کپاس اور مہنگ بولی جاتی ہن۔

حیوانات | شیراب تقریباً مفقود ہے۔ کچھ بھی بہت کم ہن۔ جیتے بھر خضر کے قریب نظر آتے ہن۔ بھیر۔ پائیندوا۔ لکڑ بھگا۔ ٹوٹری۔ سیار جنگلی بو بھیر۔ بکری۔ اور اونٹ بہ کثرت ہن۔ سیدانوں میں غزال جھیلوں کے قریب گو تر خر۔ بہاڑوں پر جنگلی بھیر میں اور ہرن۔ نازندران میں بارہ شنگے اور عربستان اور بحرہ کے اطراف میں بھینسے موجود ہن۔ میدیہ کے گھوڑے جیسے بنائی گھوڑے کہتے تھے زمانہ قدیم میں ساری دنیا میں مشہور تھے یہ گھوڑے سمند ابلق یا بھورے رنگ کے آتھے۔ اور تیز رفتاری و جفاکشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سفید گھوڑے متبرک سمجھے جاتے تھے۔ بادشاہ ان کی قربانی کرتے اور آجکل بھی ان کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ پرندوں میں باز۔ شاہین۔ گدھ۔ چیل۔ کوسے۔ بیل۔ ذراچ۔ تیر۔ بھٹ تیر۔ ترغلی۔ راج ہنس۔ اور ماہی خور وغیرہ ہن۔

معدنیات | قدیم زمانے میں ایران معدنیات کے لیے مشہور تھا۔ المہی میں سب سے پہلے تانبے کی کان دستیاب ہوئی تھی کوہ دلموند

سے لاجور دن نکلتا تھا۔ اور زبرد۔ کچھ آج۔ نیکم۔ عقیق۔ سونے۔ چاندی۔
 تو ہے ابڑیسے وغیرہ کی کابین بھی بکثرت آتھیں۔ اور اب بھی موجود
 ہوں گی۔ مگر لوگ ان کی طرف سے غافل ہیں۔ اب سوائے تھوڑے سے
 کوئلے اور تانے۔ گندھک۔ گیرد۔ اور سٹی کے تیل کے اور کسی چیز سے
 دائرہ نہیں چاہل کیا جاتا۔

المصاب

یہ نظم ہمارے عنایت فرامو لوی غلام طیب صاحب
 بی اے بی ٹی مدگار عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن
 نے ہین دگداز کے لیے عنایت فرمائی ہے۔ ہم اسے
 شکر کے ساتھ درج کر کے ہدیہ ناظرین کرتے ہیں
 ہر ناظرین اس کا اندازہ خود ہی فرمائیں کہ حقیقی
 جذبات کو کس موثر پیرائے میں ادا کیا گیا ہے۔

محمد صدیق حسن

ایڈیٹر

نوٹ

ایک شاعر اپنی محبوبہ کو سپرد خال کر کے اپنے خیالات سے
 ہمکلام ہے۔

اے مری جان مری ساری دنیا	اے مری جان مری ساری دنیا
خواب راحت سے ذرا ہو بیدار	خواب راحت سے ذرا ہو بیدار
کیسے بھایا تجھے یہ فرض زمین	کیسے بھایا تجھے یہ فرض زمین
نازد و انداز تجھے بھول گئے	نازد و انداز تجھے بھول گئے
آج تنہائی ہے اور گوشہ تنگ	آج تنہائی ہے اور گوشہ تنگ
ہے غضب کچھ نہیں ملتا جواب	ہے غضب کچھ نہیں ملتا جواب

خیر حساباً ہوں نہ آؤں گا کبھی
 خواب میں تم ہو تو سیدار ہوں تین
 تم کو اللہ نے بہت دے دی
 راحت روح تمہیں درد مجھے
 ہاں گریہ تو میں پوچھوں گا ضرور
 ساتھ کس کا ہے کہاں رہتے ہو
 کیا تمہیں دھیان مرا ہے کہ نہیں
 کیا خیال غم دنیا بھی ہے
 کبھی آتا ہے تمہیں گھر کا خیال
 تم تو خاموش ہو یہ بات ہے کیا
 مست رہتے ہیں جہاں پیر و جوان
 ان کی فطرت بھی بدل جاتی ہے
 توڑ دیتے ہیں وہ رشتے سارے
 جکڑے رہتے ہیں وہ زنجیروں میں
 اب بھی تم چپ ہو یہ حالت کیا ہے
 آج تک ایسی طبیعت تو نہ تھی
 دل تمہارا کبھی یوں سرو نہ تھا
 دوسرا نام ہے بد خوئی کا
 یا کہ سیرت کا بدل جانا ہے
 یا ستم کش ہو کہ مجبور رہی ہے
 کیا تمہیں یاد نہیں نکل کی ہے بات
 چھڑ کر تم مجھے بلوائے تھے
 دور جانے نہ کبھی دیتے تھے
 میرے جانے سے ستم ٹوٹا تھا
 چار دن کے لیے باہر جانا
 تم کو آ کر نہ سناؤں گا کبھی
 تم تو فاضل ہو یہ ہشیار ہوں میں
 اور مجھے رنج کی لذت دیدی
 تم کو غفلت نفس سر دیتے تھے
 مجھ سے رہتے ہو بھلا کتنی دور
 کس کے پردے میں نہاں رہتے ہو
 دل محبت سے بھرا ہے کہ نہیں
 مجھ سے ملنے کی تمنا بھی ہے
 کیا تمہیں ہے دل مضطرب کا خیال
 موت بھی کوئی خراب بات ہو کیا
 اور سنتے نہیں غیروں کی فغان
 اور طبیعت بھی بدل جاتی ہے
 مر کے بنتے ہیں رشتے سارے
 محو رہتے ہیں کہ تصویر دن میں
 سچ بتاؤ یہ نصیبت کیا ہے
 تم میں چپ رہنے کی عادت تو نہ تھی
 سنگ خارہ نہ تھا بے درد نہ تھا
 موت حیلہ ہے ستم جوئی کا
 اپنے آپ سے نکل جانا ہے
 بے تعلق ہو کہ مجبور رہی ہے
 بے ہنسے تم کو نہ ملتی تھی غات
 میرے چپ رہنے یہ جھنجھلائے تھے
 وعدے سو سو طرح کے لیے تھے
 میں نہ آتا تھا تو دم ٹوٹا تھا
 تم یہ ہوتا تھا قیامت لا

خیر حساباً ہوں نہ آؤں گا کبھی
 خواب میں تم ہو تو سیدار ہوں تین
 تم کو اللہ نے بہت دے دی
 راحت روح تمہیں درد مجھے
 ہاں گریہ تو میں پوچھوں گا ضرور
 ساتھ کس کا ہے کہاں رہتے ہو
 کیا تمہیں دھیان مرا ہے کہ نہیں
 کیا خیال غم دنیا بھی ہے
 کبھی آتا ہے تمہیں گھر کا خیال
 تم تو خاموش ہو یہ بات ہے کیا
 مست رہتے ہیں جہاں پیر و جوان
 ان کی فطرت بھی بدل جاتی ہے
 توڑ دیتے ہیں وہ رشتے سارے
 جکڑے رہتے ہیں وہ زنجیروں میں
 اب بھی تم چپ ہو یہ حالت کیا ہے
 آج تک ایسی طبیعت تو نہ تھی
 دل تمہارا کبھی یوں سرو نہ تھا
 دوسرا نام ہے بد خوئی کا
 یا کہ سیرت کا بدل جانا ہے
 یا ستم کش ہو کہ مجبور رہی ہے
 کیا تمہیں یاد نہیں نکل کی ہے بات
 چھڑ کر تم مجھے بلوائے تھے
 دور جانے نہ کبھی دیتے تھے
 میرے جانے سے ستم ٹوٹا تھا
 چار دن کے لیے باہر جانا

آج اس درجہ تکلف ہے تمہیں
نہیں ملتی ہے اجازت بھی نہیں
کیا تمہیں بھول گئیں وہ باتیں
عہد و صل کی زندہ باتیں
دل سے بجلی کا وہ آنا جانا
اپنی ہی باتوں سے شرما جانا
روان روان تھا زبان دل و فتر
وہی باتیں وہی ست شامِ فتر
بدلیاں اور وہ ساون کا سماں
جبکہ دل آٹھ بہر تھا خندان
وہ ہواؤں سے نظر کا اڑنا
اور سینے سے خگر کا اڑنا
بے پیہ وہ مئے صافی کی ترنگ
مستی و عیش و مسرت کی اُنگ
ہاں وہ گوش و نظر کی جنت
وہ مرے قلب و جگر کی جنت
آج خاموش پڑی ہے تہ خاک

نہ وہ سووانہ وہ قلب بیباک

موت اور زیت کا کیا ساتھ بھلا
گم جداراگ جدا ساز جدا
چاہے بولو کہ نہ بولو ہم سے
یہ کہے جاتے ہیں جانان تم سے
موت کے پھیر میں مت آ جانا
سوزِ الفت سے نہ گھبرا جانا
تم رہو دور کہ نزدیک رہو
عیش و آرام ملے۔ رنج سہو
پر نہ تکمیل سے غافل رہنا
اور نہ تحصیل سے غافل رہنا
روح کو دور و مجسم کرنا
ہم سے چھٹنے کا نہ آلم کرنا

اطلاع

جملہ خریداران دگلڈز کی خدمت میں التماس ہے کہ خط و کتابت میں اپنا
نمبر خریداری لازمی طور پر بتا دیا کریں جو ان کے پتہ کے ساتھ لکھا ہوتا ہے جس پر
نمبر اس اڈا کھانہ کا نمبر اس کے حوالہ کی ضرورت نہیں۔ اگر نمبر کا حوالہ نہ
ہو گا تو ممکن ہے جواب میں تاخیر ہو یا جواب ہی نہ دیا جاسکے۔
نیچر دگلڈز



شاعر کو معشوق چاہیے۔ اور شراب اور غواہی۔ بس یہی دو چیزیں اس کی دنیا ہیں۔ اور اُنھیں دو پر اُس کی زندگی ہے۔ ہمارے فارسی اور اردو شاعروں کا معشوق ایک خوب صورت لڑکا ہے جسے نہ اُنھوں نے کبھی دیکھا ہے۔ اور نہ اُسے پہچانتے ہیں۔ اپنے دل کی لوح پر وہ مصور کی طرح اُس کی ایک خیالی تصویر کھینچتے ہیں۔ اور اس پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ یہ معشوق اگرچہ ہمیشہ اُن کے دل میں رہتا ہے اور ہر وقت اُن کے پاس موجود ہوا کرتا ہے مگر اُنھیں فراق کی شکایت ہے۔ اسی غم میں رو تے پیتے ہیں۔ آہ و زاری کرتے ہیں اور ایک ایک کے آگے دکھار دے پھرتے ہیں۔

اسی آتش فراق کی گرمی سے بیابا ہو کر جب وہ اس کی تلاش میں نکلتے ہیں تو وہ اُنھیں کسی بت خانے میں مل جاتا ہے۔ اور اس کا ذوق و شوق بیابا کرتا ہے تو بت پرست بن کے کعبے کی طرف سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور زینار گلے میں ڈال کے برہمن بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جب نئے ارغوانی کی جستجو میں سرگرداں ہوتے اور دل کی لگی بجھانے کو نکلتے ہیں تو وہ اُنھیں آتش پرستوں کے بوڑھے مقتدا (پیرمغان) کے پاس ملتی ہے۔ اور اُس آب آتشین کا شوق اُنھیں آتش پرست بنا دیتا ہے۔

دنیا کے صاحب فہم لوگ اس بات کو کس قدر حیرت اور تعجب سے دیکھتے ہوں گے کہ ایک شاعر جو اپنے آپ کو مسلمان بتاتا ہے۔ توحید کا قائل ہے۔ شرک کو کفر جانتا ہے وہی شعر کہتے وقت یکا بت پرست بنجاتا ہے۔ اپنی زبان سے اپنے کافر ہونے کا اقرار کرتا ہے اور آواز بلند کرتا ہے ع "کافر عشقم مسلمان مراد کار نیست" اسی طرح شراب کو وہ حرام و نجس جانتا ہے۔ اور اس کی مصرتوں سے بخوبی واقف ہے۔ مگر شاعری کی دنیا میں آیا اور صدالگائی کر ع "بدہ سابقا آب آتش لبس" اور اس کے بعد دعوے کے ساتھ کہتا ہے۔

من از شراب بخورم بیا نک کوس میخورم پیالہ ہائے وہ منی علی الروس میخورم
شراب گبری چشم منے مجوس میخورم

اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی یہ بات ہے کہ کوئی ہندو جب فارسی کا شاعر بنتا ہے تو کافر بننے کے شوق میں مسلمان بنتا ہے اور مسلمان ہونے کے بعد کفر کا دعویٰ کر کے بتوں کو پوجتا اور شراب اور غوانی کے جام لٹھھاتا ہے۔

اسی پر منحصر نہیں۔ ہمارا مسلمان شاعر مذہب اگر چہ بت پرست بن گیا ہے اور علانیہ طور پر بتوں کے آگے سجدہ کرنے کا اعتراف کرتا ہے۔ مگر تعجب کی یہ بات ہے کہ جس طرح ہم اسے کعبے سے منہ پھیر کے بتخانے کی طرف جاتے دیکھتے ہیں اسی طرح یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کبھی وہ کنشت (آتشکد) کی طرف کل گیا۔ اور کبھی دیر (گرجے) میں گھس گیا اس کے کنشت میں جانے کی تو خیر یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ شراب خانہ خراب کے شوق میں جوار اوت و عقیدت اسے پیر معان کے ساتھ ہو گئی ہے وہی شاید اسے آتش پرستوں کے معبد میں گھسنے لے گئی ہوگی۔ مگر یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دیر میں کیوں گیا؟ وہاں کیا رکھا؟ اور کس چیز کا شوق معبد نصاریٰ میں گھسنے لے گیا؟ نہیں معلوم یہ اس کا اضطرابی و اتفاقی فعل ہے۔ یا محض ایک حرکت اضطرابی ہے۔

ممکن ہے کہ شراب کے نشے میں بہکا کے بعض تجانے کے گرجے میں جا پڑا ہو۔ یہ بھی خیال ہو سکتا ہے کہ وہ ہندو شان کے موجودہ گرجے میں نہ گیا ہو گا جو زیادہ تر پرنسٹن مسیحیوں کے ہیں بلکہ وہ پرانے کیتھولک عیسائیوں کے کسی کنیسے میں جس صد ہا تصویریں اور دو تین موجود ہوتی ہیں تجانے کے دھوکے میں چلا گیا ہو گا۔

لیکن یہ تو جہیں شاعرانہ خیال آفرینان ہیں۔ اصلیت کچھ اور ہی ہے جس کا حال مسلمان شعرا کی تاریخ پر غور کرنے سے شاید معلوم ہو سکے اور ہم سمجھتے ہیں کہ معشوقوں کی تاریخ دلچسپی سے بھی خالی نہ ہوگی۔

عرب میں شاعری اسلام سے پہلے تھی۔ اور وہ ایسی شاعری تھی جس کے نظری جذبات کا پتہ بعد والے ترقی یافتہ شعراء عرب کے کلام میں نہیں ملتا۔ پرانے شعراء عرب کی عام معشوقہ ان کی بنت عم (چچا کی بیٹی) ہوا کرتی تھی۔ جو اکثر اُن کی منکو صہ بی بی ہو جاتی۔ اُس کا نام وہ بے شکلف دلا تامل اپنی نظموں میں لیتے۔ اور اُس کے عشق میں جذبات دلی کو ظاہر کرتے۔ اگر اُن کی آرزو کے خلاف اُس کے ساتھ شادی نہ ہوئی اور وہ اُن سے چھوٹ کے اور بچھڑ کے کسی اور وادی یا صحرا میں چلی گئی تو اُس زمانے کو جب اُس سے ملتے جلتے تھے اُن مقاموں کو جہان اس کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے اس کے گھر کو۔ اس کے خیمے کے گرد کے منظر کو پاس کے جلو کے درخت کو۔ اور اس کی ہنسیوں پر بیٹھ کے گونجنے والے کبوتروں کو یاد کر کے روتے۔ اور جب کبھی موقع مل جاتا تو راتوں کو جب سب لوگ سوتے ہوئے اور ہر طرف خاموشی کا عالم طاری ہوتا۔ وہ تارون کی روشنی میں اُس کے قبیلے کی صحرائی فرود گاہ میں دبے پاؤں جاتے۔ چورون کی طرح اس کے خیمے میں گھنٹے آہستہ سے اُسے جگانے اور باہر لاکے کسی تو وہ ریگ کے گھونگھٹ میں یا کسی جلو کے درخت کے نیچے بیٹھ کے اُس سے عشق و محبت کی باتیں کرتے۔ وہ ڈراتی کہ بیان اپنے دشمنوں میں بے دھڑک کیون گھس آئے ہو یا میرے باپا

بھائی اور میرے قبیلے والے ذرا بھی سُن گئے تو بوجہ اڑا دین گئے۔ یہ اس کے جواب میں اپنی بہادر بیان ظاہر کرتے۔ اپنی شہنشاہی و نیز بازی کے کمالات بیان کرتے۔ پھر صبح سے پہلے ہی اُسے اُس کے خیمے میں واپس بھیج کے پلٹ آئے۔ اور اس واقعے کو نہایت ہی مزے اور جوش کے الفاظ میں موزون کر کے قدر و امان سخن کے سامنے پیش کر دیتے۔

اگرچہ بادی النظر میں یہ بہت ہی بد اخلاقی کا نمونہ معلوم ہوتا ہے مگر پرانے شعرا اور اُن کے حال سے واقفیت رکھنے والے و ثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان عاشقانہ ملاقاتوں میں بد اخلاقی برہنیتی اور بے عصمتی کو ذرا بھی دخل نہ ہوتا تھا۔ لیکن معشوقہ کے ساتھ اگر شادی ہو چکی ہو تو اپنی نظموں میں وہ اس سے جامِ شراب مانگتے۔ پھر اس کے حسن و جمال کی تعریف کرتے اور اُس کے بعد اپنے قبیلے کے مفاد و اڑا دین کی بہادری فیاضی اور عظمت کے کارنامے زور و شور اور جوش و خروش کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دیتے۔

یہ تھی عرب کی پہلی شاعری۔ جس میں اُن کی معشوقہ ہمیشہ ایک خوبصورت عورت ہوتی اور وہ بھی اُن کے چچا کی بیٹی یا قبیلے کی کوئی اور لڑکی جو اُن کی منگیتر یا منکوحہ بی بی ہو سکتی یا ہوتی۔ یہی مذاق اسلام کے بعد والی پہلی دو صدیوں کے شعرا کا بھی تھا۔ فرق اتنا تھا کہ شعرا سے جاہلیت کی معشوقہ مین لازمی طور پر کچھ زیادہ امتیاز نہ رکھتی تھیں۔ اور اُن کے شوق میں غزل سراپی کرتے وقت وہ اُس کی حسن و تعریف چاہیں کر جائیں۔ مگر اپنی کہنے میں اُس کی بہت کم سنتے تھے اس زمانے کی بہت سی عورتیں گو کہ شاعرہ تھیں مگر وہ زیادہ تر اپنے عزیز و نیاں شوہروں کی موت پر لوحِ خوانی کرتیں۔ اُن کے فضائل بیان کرتیں۔ اُن کی شجاعت، سخاوت، اثباتِ نفس اور ہمدردی کے کارنامے سناتیں۔ اُس کے دشمنوں کی تحقیر کرتیں اور خاموش ہوجاتیں مگر معشوقہ کی حیثیت سے عاشقوں کے جذبات پر اپنے خیالات ظاہر

کرنے کا اُن دنوں رواج نہ تھا۔

اسلام کے بعد یہ ہو گیا کہ عاشقانہ جذبات ظاہر کرنے والے تمام شاعروں کی مشوقائیں اُن کے عشق کی قدر کرتی ہیں اور اُن کے بیانیہ جوش و خروش کا جواب اپنے سوز و گداز بھرے ہوئے شعروں میں دیتیں۔ اس عہد کے اکثر شاعروں کی مشوقائیں بھی انھیں کی طرح مشہور ہیں۔ اور اُن کے دیوان صرف اُن کے نہیں بلکہ اُن کے اور اُن کی محبوبہ کے کلام کے مجموعے ہیں۔ جمیل شاعری مشوقہ بنتی تھی۔ کثیر کی مشوقہ عروہ تھی۔ قیس بن ذریح کی مشوقہ کبتی تھی۔ مجنون عامری کی مشوقہ لیلیٰ تھی۔ عروہ بن خزام کی مشوقہ عفرہ تھی۔ عبداللہ بن عجلان کی مشوقہ بنت تھی۔ ذوالرومہ کی مشوقہ سیتہ تھی۔ آکاس کی مشوقہ جنوب تھی۔ عبداللہ بن علقمہ کی مشوقہ تبیس تھی۔ نصیب کی مشوقہ زینب تھی۔ برقس کی مشوقہ آسماء تھی۔ عقبہ بن جباب کی مشوقہ زینب تھی۔ کعب کی مشوقہ مہلار تھی۔ اور اسی طرح کے اور بہت سے عاشق و معشوق تھے جن کے حالات عربی تاریخ و ادب کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان دنوں شعر و سخن کا ذوق عربوں کی سوسائٹی میں اس قدر برقرار رہا تھا کہ بعض شریف زادیان خود ہی چاہتیں کہ اُن پر کوئی شاعر عاشق ہو سکے۔ ان کی تعریف میں غزل سرائی شروع کر دے۔ اُسکے عروہ کو اس کو گوارا نہ کر سکتے۔ مگر وہ بھی محض کسی شاعر کی تشبیب کی وجہ سے پاکدامن خاتون کی عصمت پر شبہ نہ کرتے۔ اس لیے کہ شاعروں کے عشق کے لیے بالاتفاق پاکدامنی و عصمت لازمی تھی۔ اور شعرا کی تشبیب سے کسی شریف زادی کے ناموس پر حزن نہ آتا۔ یہ بات جاہلیت میں بھی موجود تھی۔ آخر زمانہ جاہلیت کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مستند شاعر اعشى تھا۔ جس نے حضرت رسول خدا صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کے آپ کی نعت میں چند شعر بھی کہے تھے۔ تمام شعراء عرب اُسے سب سے بڑا شاعر مانتے تھے۔ اور عرب میں کھر کھر مشہور تھا کہ وہ جس کی تعریف کرتا ہے وہ چمک جاتا ہے۔ اور جس کی مذمت کرتا ہے وہ مٹ جاتا ہے۔ اس کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی میری تین بیٹیاں ہیں اور تینوں کنواریاں بیٹی ہیں۔

آپ اُن میں سے ایک پر اشعار میں اظہارِ عشق کیجیے تو اس کی شادی ہو جائے۔ اُغشی نے منظور کر لیا۔ اور اُس کے شوق میں چند اشعار کہے ہی تھے کہ اُس کی ماں نے ایک اونٹ ہدیہ بھیجا اور اطلاع دی کہ اس لڑکی کی تو آپ کی عنایت سے شادی ہو گئی۔ اب آپ دوسری پلاظہارِ عشق کریں۔ اُغشی نے دوسری کی تقریب میں بھی شعر کہے اور اُس کی شادی بھی ہو گئی۔ اسی طرح تیسری کی شادی بھی اُغشی کی تشییب سے ہوئی۔

عہدِ نبی عباس کے اوائل میں امین الرشید کے ایسے بد احبلاق خلیفہ اور ابو نو اسبن کے ایسے بے تنگ و بے حمیت شاعر کی بدکار یوں نے پہلے پہل شعر کے معشوقوں میں امر و دحسین لڑکون کو داخل کرنا شروع کیا ہیں صحیح طور پر نہیں معلوم کہ امر و دحسین کا مرض ایرانیوں میں ساسانیوں کے وقت سے چلا آتا تھا یا عربوں کے فتحا ہونے کے بعد اُن عربوں میں جو صحرائی وطن کو خیر باد کہے خراسان و عجم میں آباد ہو گئے تھے اور اپنی بیویوں سے دور تھے خود بخود پیدا ہو گیا۔ لیکن دوسری صدی ہجری کے وسطی سے ہم تعجب کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ بعض شعراء عرب کے معشوق بجاے اُن کی بیویوں یا قبیلے کی ناز آفرین لڑکیوں کے نو عمر لڑکے بن گئے۔

ان دنوں شام و روم اور عراق و آرمینیا وغیرہ میں عیسائیوں کے صدا گرجے تھے اور اُن کے متعلق بڑی بڑی خانقاہیں تھیں۔ ان خانقاہوں میں نفس کش راہبوں کے علاوہ بہت سے نو عمر اور حسین لڑکے تقدس و ربہایت کے مخصوص سادے لباسوں میں رہا کرتے اور روحانی تعلیم پاتے۔ ریاضتیں کرتے۔ ضربیں لگاتے۔ اور نفس کشی کی کوشش کرتے۔ ان میں سے اکثر حسین و خوب و ہونے اور اُن کی خاص وضعوں میں سادگی کے ساتھ کچھ ایسا بائبلین ہوتا کہ عاشق مزاج اُن پر فریفتہ ہو جاتے۔ اور مشہور ہو گیا تھا کہ حسنین کا مجمع دیکھنا ہو تو گر جون اور خانقاہوں کی سیر کرنا چاہیے۔ ان خانقاہوں کے متعلق پُر فضا باغ ہوتے اور راہب اپنے ہاتھ کی محنت سے اُنھیں نہایت پُر فضا اور سرسبز و شاداب رکھتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں

شعرا عرب کے معشوق یہ خانقاہوں کے خوب روڑے بن گئے۔ اور
گرچہ ان کی سواد وہ چمن قرار پائے جس میں عربی باغ سخن کے بلبل آئے
نغمہ سنجی کا جوش دکھائے۔

روز بروز مذاق بڑھتا گیا اور بے تکلفی نے شعرا
عرب کی زبان سے کلام دیا کہ ہمارا معشوق دیر کا ایک خوبصورت لڑکا
ہے جو نصرانی ہے اور اس کے شوق میں ہم صلیب پرستی کو تیار ہیں۔ بیان
تک کہ مدرک بن علی شیبانی جو ایک بڑا صاحب فہم شاعر اور زبردست
ادیب تھا اور اسلامی دنیا میں وقعت و وقار پیدا کر چکا تھا عمر و بن یحنا
نام ایک خوبصورت مسیحی لڑکے پر عاشق ہو گیا جو شرفی بغدادی مشہور
خانقاہ "دیر و دم" میں رہا کرتا تھا۔ مدرک نو عمر لڑکوں کو درس دیا
کرتا تھا اور اُسکی درس گاہ میں یہ مسیحی لڑکا بھی آتا تھا۔ مدرک صاحب
پڑھاتے پڑھاتے اس پر عاشق ہو گئے۔ اور عشق نے اس قدر بیتاب
کیا کہ ایک دن اشنائے درس میں آپ نے ایک رقعہ لکھ کر اس
کی طرف پھینکا جس میں دل کی بقراری و بیتابی کو صاف صاف ظاہر
کر دیا تھا۔ عمر و بن یحنا کو وہ رقعہ پڑھ کر ایسی شرم آئی کہ اُن کی درس
گاہ میں آنا ہی چھوڑ دیا۔ اب مجبوراً ملا صاحب معشوق کی سیادت کے
لیے دیر میں پہنچنے لگے۔ اُس نے وہاں بھی ان سے ملنا ترک کر دیا۔ تب
ملا صاحب جا رہے تھے۔ ہوش و حواس میں فرق آ گیا۔ اور حالت ایسی
نازک ہوئی کہ لوگ گھر گھر کے اُس لڑکے کو بغرض عیادت لے آئے۔ ملا
صاحب نے معشوق کی صورت دیکھتے ہی چند شعر حسب حال پڑھے۔
اور ایک آہ کے ساتھ جان دیدی۔ جس کا بڑا اثر پڑا۔ اور اُن کا
عشق صادق قرار پا کے اسلامی محبتوں میں غیر معیوب بنایا
کیا جانے لگا۔

اُن ملا صاحب نے اپنی ساری شاعری اسی نصرانی معشوق
کے فراق کی شکایت میں صرف کر دی ہے۔ خصوصاً ان کا محسن آریہ

مقبول ہوا جس میں اُنھوں نے مسیحوں کے تمام عقائد و خیالات اور اُن کے
مقتداؤں اور معبدوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے کہتے ہیں کہ میرا گناہ صرت اتنا
ہے کہ مسلمان ہوں لیکن میرے افعال نے میرے اسلام کو ایسا ناقص کر دیا
ہے کہ اس کی شکایت ہی کیا؟ پھر کہنا شروع کیا ہے کہ کاش میں صلیب
ہوتا کہ وہ اُسے چومتا۔ اس کا زنا رہتا کہ اس کی کمرین لپٹا رہتا۔ اس
کا کرتا ہوتا کہ سینے سے لگا رہتا۔ اس کا پاؤں چامہ ہوتا کہ اُس کی ٹانگوں
کو اپنے آغوش میں لیے رہتا۔ اُس کا کینسہ ہوتا۔ اس کی انجیل ہوتا۔
پھر اس کے بعد اسے باپ بیٹے روح القدس، "حضرت مریم"
حواریوں۔ ستر دا یعون۔ مسیحی دیون اور راہبوں اور خدا جانے کن کن
چیزوں کا واسطہ دلایا ہے کہ مجھ پر ترس کھا۔

اب اس زمانے میں اکثر عربی شعرا کا کوہ جانان کوئے دیر
اور گر جاتھا اور اُن کا معشوق کوئی نصرانی لڑکا۔ ابن المعتز عباسی جو
عہد مولدین عرب کا بڑا مقبول عام شاعر تھا اپنی ایک دلچسپ نظم میں
کتنا ہے:-

"دیر عربوں پر اور طیور کے اُس نشیمن پر جس میں خوب سایہ دار
اور گھنے درخت ہیں گھنٹھو گھنٹھو برسسی۔ اور اکثر یہ ہوا ہے کہ صبح تڑکے ہنوز
چڑیاں اپنے نشیمنوں سے نہیں اڑنے پائی تھیں کہ راہبان دیر نے اپنی
عبادت کی صداؤں سے مجھے جام صبحی پینے کے لیے جگا دیا (کون سے راہبان)
جو سیاہ قبائین پہنے ہیں۔ صبح کے وقت زور و شور سے ضربیں لگاتے
ہیں۔ کروں میں زنا رہا بندھے ہیں۔ اور سردن پر اپنے بالوں سے اُنھوں
نے تاج سے بنالیے ہیں۔ اُن میں سے اکثر خود بہرہ میں جن کی آنکھوں میں
عمر کا سرمہ لگا ہے۔ اور پلکین آنکھوں کی بلاق سفیدی و سیاہی پر اپنی چلین
ڈالتے ہیں (ان میں سے ایک کہ میں نے ایسے شوق کی نظر سے دیکھا کہ راضی
کر کے اشارے اشارے میں ملاقات کا وعدہ لیا اور (وعدے کے مطابق)
وہ رات کے کرنے میں بدن چڑاے اور کسی تمام کے خون سے جلدی جلدی

قدم اٹھاتا ہوا آیا۔ میں نے شوق استقبال میں عاجزی کے ساتھ اپنے رخسارے بچھا دیے۔ اور اس طرح دامنوں کو زمین پر کھینچتا ہوا چلا کہ اس کے نقش قدم سننے جاتے تھے۔ ہلال آسمان پر چمک رہا تھا اور ڈور معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہمیں رسوا نہ کر دے۔ اور بعینہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی کا ناخن کٹ کے الگ ہو گیا ہو۔ پھر اس کے بعد جو ہوا سو ہوا۔ میں اُس کا ذکر نہ کروں گا۔ بس تو نہ بدگمانی کر اور نہ پوچھ

تا ہم قدامت کا اتنا اثر ضرور باقی تھا کہ عورت معشوقا میں بالکل نہیں جھوٹنے پائی تھیں اور اس عہد کے شعراء عرب کی یہ حالت ہے کہ اُن کا معشوق کوئی معین و مخصوص شخص نہیں ہوتا۔ جسے کبھی وہ عورت بتاتے ہیں اور کبھی مرد۔ جب عورت ہوتی ہے تو عموماً اُن کے چچا کی بیٹی ہوتی ہے لیکن جب وہ مرد ہوتا ہے تو اکثر وہ اُسے کسی دیر میں جا کے ڈھونڈتے ہیں۔

اسی زمانے سے فارسی شاعری شروع ہوئی۔ اور اُسے چونکہ عربوں کے ”ہوم“ وطن سے تعلق نہ تھا اس لیے وہ بُرائی رفیق چچا کی بیٹی گھر ہی میں جھوٹ گئی جس نے اپنے صحرائی خیموں کو نہ جھوڑا اور اُنھیں بھی اُس سے کچھ سرد کا نہیں رہا۔ اس لیے اب اس فارسی شاعری کا معشوق وہی خوبصورت لڑکا رہ گیا جو پہلے پہل دیر میں ملتا تھا اور چونکہ مسلمان شعرا کو شعر و سخن کی معرفت کا فردن کے بعد دن میں جانے کی عادت پڑ گئی تھی اس لیے وہ ایران میں دیر نصاریٰ کے عوض آتش پرستوں کے کنشت کھنڈن نکل گئے یہ ہمیں نہیں معلوم کہ ان دنوں کنشتوں کی کیا حالت تھی۔ خدا جانے دیر دن کی طرح وہاں بھی عاشقانہ دلچسپیوں کا سامان تھا یا نہیں۔ لیکن کفرستان میں جانے کی عادت شعرا کو اکثر کنشت میں لے گئی۔ خصوصاً اس چیز نے آتش پرستوں کے بعد سے زیادہ مالوس کر دیا کہ شراب جو شام و بعد ازین نصاریٰ کے ہاتھوں سے ملتی تھی یہاں صرف زرتشتی عقائد والوں سے ملتی۔ چنانچہ پیر معنان کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد کبھی کبھی انھوں نے یہ بھی قبول کیا کہ ہمارا معشوق کنشتا میں ہے۔

اب شعراے عجم اپنے کفر کی آذاد یون میں اور آگے بڑھے۔ ایرانیوں کو چین والوں سے پڑائی رہا بت گئی۔ وہ چین کی نقاشی و صورت گری کے قائل تھے خصوصاً تائی کے واقعات سے ان میں چین کی مصوری کا بڑا شہرہ ہو گیا تھا اس شہرت نے انھیں چین کے بت خانوں کا شوق دلایا۔ اور بغیر اس بات کے معلوم کیے کہ چینیوں کے بت خانوں میں دراصل کیا ہوتا ہے۔ انھیں اُن خیالی تصویروں کا شوق ہوا جو اُن کے خیال کے مطابق بت خانہ ہائے چین میں یقیناً اس نئے خیال کا آنا تھا کہ فارسی شعرا میں بت خانوں کا چرچا ہونے لگا۔

اسی اثنا میں مسلمانان عجم ہندوستان میں آئے۔ اور اردو زبان پیدا ہوئی۔ اور اُس کی شاعری نے فارسی شاعری کے آغوش میں پرورش پائی اسی فارسی شاعری کی معرفت وہ کینسہ ہائے شام کا کافر ماجرا معشوق اردو شعرا کو مل گیا جسے مسلمان لائے تو باہر سے تھے۔ مگر اس کا مسکن بیان نہ گرجا رہا نہ کنشت بلکہ ہندوستان کے بخانے ہو گئے۔ شعراے فارسی کی تقلید میں وہ معشوق کی جستجو کرتے وقت کبھی کبھی دیر و کنشت کو بھی جھانک کے دیکھ لیا کرتے ہیں مگر اب ان کا اصلی رجحان بت خانوں کی طرف ہے۔ بت پرستی کے تمام شعراء اُنھوں نے اختیار کر لیے ہیں اور بت ہی کو اپنا اصلی معشوق بتاتے ہیں۔

ایرانیوں ہی کی تقلید میں اردو کا معشوق بت ہونے کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکا ہے۔ عورت کے حسن سے اُنھیں سرو کار نہیں۔ اور بڑی حیرت کی یہ بات ہے کہ جن بت خانوں میں اپنے بُت دربار کو بتاتے ہیں ان میں دیوتاؤں کی بھی صورتیں ہیں۔ اور دیویوں کی بھی۔ گردیوتاؤں کی صورتیں عموماً عظمت و جبروت اور قوت و طاقت کا نمونہ ہوتی ہیں۔ اُن کے بہت سے ہاتھ اور کئی سر ہوتے ہیں۔ وہ ایسے رعب و داب کے مظہر ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کے بجائے عشق و محبت کے ان سے خوف اور ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ان دیویوں کی صورتیں البتہ حسن و جمال کی مکمل تصویریں ہوتی ہیں۔ اس لیے ان بت کدوں میں اگر معشوقیت کی شان ہے تو دیویوں میں۔ لیکن ہمارے شعرا کو ان سے سروکار نہیں وہ بے دیکھے بھالے اور بے سوچے سمجھے اپنے استاد شعراے فارسی

کی اندھی تقلید میں ان بت خالوں کے مرد معشوق ہی پر عاشق ہیں۔
یہ ہے تاریخ ہمارے شعراے اسلام کے معشوق کی۔ جوان کے دلون
میں ہے۔ اور پھر بھی جدا ہے۔ اور جسے لاہ پہچانتے نہیں۔ مگر عاشق ہیں۔ یقین ہے
کہ اس تاریخ کے پڑھنے سے یہ سمجھ جوی حل ہو گیا ہو گا کہ ان کا معشوق کیون
ایک خوبصورت لڑکا ہے۔ عورت نہیں؛ کیون اس کے شوق میں وہ زیادہ تر
تخالون کی طرح اور کبھی کبھی دیر و کشت میں جاتے ہیں؛ ہم انہیں اس جرم خلاف
وضع فطری میں مبتلا دیکھ کے افسوس کرتے اور پچھتاتے ہیں کہ کاش اگر سلسلہ نسب
کے دور پڑ جاتے سے پرانی بنت عم چھوٹ گئی تھی تو کوئی اس کی ہندوستانی بہن ہی
معشوقہ بن جاتی۔ یا اگر ہندوستان کے اثر سے ہمارے شعرا میں مردانگی کی قوت
بالکل فنا ہو گئی تھی۔ تو وہ ہندی شعرا کی طرح عورت بن جاتے۔ اور عورت بن لینے
کے بعد کسی مرد کو اپنا معشوق بناتے۔ مگر آہ! نہ یہ ہوا اور نہ وہ ہوا۔ اور محض مجرمین
کی کثرت کی وجہ سے ہماری فیاض گو رنشت کو ہمارے ان لمزمان جرم وضع خلاف
فطری کو تفریبات ہند کی دفعہ ۷۷ کے اثر سے مستثنیٰ کرنا پڑا۔

ساریہ الجبل

یہ وہ الفاظ ہیں جو ایک مرتبہ دوران خطبہ میں حضرت عمر فاروق
رضی اللہ عنہ کی زبان مبارک سے بے اختیار نکل گئے۔ جبکہ آپ مدینہ میں تھے
اور یہی الفاظ اسی وقت سبز میں ایران میں منے گئے۔ اس کی اتنی شہادتیں
ہیں۔ اور ایسے ایسے معتبر مورخین راوی ہیں کہ اس واقعہ سے کسی طرح
انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ میں بے انتہا فضائل
جمع کر دیے تھے اور ان کے ہاتھوں اسلام کو وہ خوبیاں حاصل ہوئیں کہ ان
کا شمار مشکل ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایران پر فوج کشی فرمائی تو مختلف سرداروں کو
مختلف مقامات کے جھنڈے مرحمت فرمائے۔ چنانچہ آپ نے ساریہ بن ذہیم کو

قسا اور ڈار اگر دکی جانب روانہ فرمایا۔ حضرت ساریہ یہ جھنڈائے کر روانہ ہوئے۔ اور مملکت ایران میں داخل ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ایک زمانہ دراز تک ایرانیوں کا محاصرہ کیے پڑے رہے۔ یہ دیکھ کر ایرانیوں نے ادھر ادھر سے مدد طلب کی اور اُن کی بہت سی فوجیں جمع ہو گئیں۔

اب ساریہ اور اُن کے ساتھی سلمان سخت مصیبت میں مبتلا تھے اور ایرانیوں نے اُنہیں گھیر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ مدینہ طیبہ میں تشریف رکھتے تھے۔ آپؐ نے خواب میں دیکھا کہ مسلمانوں اور ایرانیوں میں جنگ ہو رہی ہے۔ صبح کو آپؐ اُٹھے تو مدینے میں سیکر وادیا کہ "الصلوة جامعة"۔ اور لوگ جمع ہونے لگے۔ جب وہ وقت آیا جو آپؐ نے خواب میں دیکھا تھا تو آپؐ باہر تشریف لائے۔ حضرت ساریہ بن زبیم اور مسلمانوں کی حالت میداں جنگ میں اس وقت بہت نازک ہو رہی تھی۔ وہ ایک ایسے جنگل میں تھے کہ اگر ذرا دیر بھی اُس میں اور ٹھہرتے تو ایرانیوں میں بالکل گھر جاتے اور پھر جان بچنے کی کوئی صورت نہ رہتی۔ اُن کے پیچھے ایک ہانڈ تھا۔ اگر وہ اس ہانڈ پر چڑھ جاتے تو پھر فقط ایک ہی سمت سے ایرانیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا۔

غرض اُس وقت حضرت عمرؓ بھرپور تشریف لائے اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ان دونوں لشکروں کو خواب میں دیکھا ہے اور اب اُن کی مفصل حالت تم سب کے سامنے بیان کرتا ہوں۔ آپؐ نے اپنی تقریر میں یہیں تک فرمایا تھا کہ دفعہ آپؐ زور سے بکار کے فرمائے لگے "ساریہ الجبل" "ساریہ الجبل" یعنی "ساریہ ہانڈ کا رخ کرو! ساریہ ہانڈ کی طرف جاؤ" یہ معلوم ہوا کہ جیسے میدان جنگ کا نقشہ آپؐ کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور آپؐ نے موقع کے لحاظ سے ساریہ کو یہ ہدایت فرمائی۔ یہ کہنے کے بعد آپؐ پھر تقریر کرنے لگے اور فرمایا کہ خدا کے بہت سے لشکر ہیں بہت ممکن ہے کہ اُن میں سے کوئی میری یہ آواز ساریہ تک پہنچا دے اور مسلمان تباہی سے بچ جائیں۔ اور خدا کی قدرت سے ایسا ہی ہوا۔ یہ آواز حضرت ساریہ اور اُن کے ساتھیوں نے سنی اور ہانڈ پر چڑھ کے مقابلہ کرتے لگے اور

اسی کا نتیجہ تھا کہ آخرین خدا نے ایرانیوں کو شکست دی اور مسلمانوں کو فتحیاب کیا۔

تاریخ کامل ابن افری نے بھی یہ واقعہ لکھا ہے اور بہت سے ائمہ حدیث نے بھی مختلف صحیح سندوں سے روایت کیا ہے جن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر تہیقی، ابو نعیم، ابن مردویہ، تالکائی، ابن اعرابی، حلیب بن، ان بھون نے اس واقعے کو مختلف الفاظ میں بیان کیا مگر مطلب سب کا ایک ہی ہے۔ چنانچہ ان روایتوں میں ایک روایت جناب ابن عمر سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک لشکر روانہ کیا۔ اور اس کا سردار ایک شخص ساریہ نامی کو بنایا۔ یہ لشکر روانہ ہو چکا تھا کہ ایک دن حضرت عمرؓ اثنائے تقریر میں فرماتے لگے "یا ساریہ الجبل۔ یا ساریہ الجبل۔ یا ساریہ الجبل" اس کے کچھ روز بعد اسی لشکر کا ایک قاصد حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے لشکر کا حال پوچھا۔ اس نے عرض کیا اے اللہ میں ہم نے دشمنوں کو شکست دی۔ جس عرصہ میں ہم لوگ لڑ رہے تھے ہم نے تین بار آواز سنی "یا ساریہ الجبل" تو ہم لوگ پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اور پھر ہم نے دشمنوں کو ہجکا دیا۔ حضرت عمرؓ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یہ آواز آپ ہی کی تھی۔ اور وہ پہاڑ جس کے پاس ساریہ تھے ملک ایران میں شہر تھا وند کے قریب تھا۔

ایک دوسری روایت ان ہی حضرت ابن عمرؓ سے یہ ہے کہ حضرت عمرؓ ایک روز جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے۔ خدا معلوم کیا بات پیش آئی کہ آپ فرماتے لگے "اے ساریہ پہاڑ کی طرف جاؤ۔ جو شخص بھڑیوں کو چرانا چاہتا ہے اپنے اوپر ظلم کرتا ہے" اس پر لوگوں کو تعجب ہوا اور سب ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ پوچھنا چاہیے۔ یہ آپ نے کیا کہا۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا تو آپ فرماتے لگے کہ مجھ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مشرکین نے ہمارے مسلمان بھائیوں کو شکست دیدی اور وہ ایک پہاڑ کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر پہاڑ کے اوپر پہنچ جائیں گے تو ان کو صرف

ایک سمت سے مقابلہ کرنا پڑے گا اور اگر اس مقام سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے تو ہلاک ہو جائیں گے۔ اس خیال سے بے اختیار میرٹ موٹہ سے وہ الفاظ نکل گئے جو آپ لوگوں نے سنے اس کے ایک مہینے کے بعد ایک شخص اس شکر سے فتح کی خوشخبری لے کر آیا تو اس نے کہا کہ ہم نے اُسی دن حضرت عمرؓ کی آواز سنی اور اُسی کے مطابق ہم پہاڑ کے اوپر چڑھ گئے پھر خدا نے ہمیں کامیاب کیا۔

تقریباً حارث سے ایک روایت ان الفاظ میں ہے کہ حضرت عمرؓ جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے کہ آپ نے خطبہ چھوڑ دیا اور دفعۃً فرمانے لگے ”یا ساریۃ الجبل“ یہی الفاظ آپ نے دوبار یا تین بار فرمائے اور پھر خطبہ پڑھنے لگے۔ اس پر لوگوں کو تعجب ہوا اور بعض حاضرین کہنے لگے کہ آپ ہمکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن حضرت عبدالرحمن بن عوف کو آپ کے متعلق اطمینان تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی خاص بات ہے۔ جب آپ خطبہ ختم کر چکے تو وہی عبدالرحمن آپ کے پاس آئے اور عرض کیا آپ نے اثنائے خطبہ میں فرمایا ”یا ساریۃ الجبل“ اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں اپنے اختیار میں نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمان ایک پہاڑ کے قریب لڑ رہے ہیں۔ اور دشمن اُن کے سامنے اور پیچھے سے آ رہے ہیں۔ تو میں نے اختیار ہو گیا۔ اور میں نے پکار کے کہہ دیا ”یا ساریۃ الجبل“ تاکہ وہ لوگ پہاڑ پر چڑھ جائیں۔ جہاں اُنھیں فقط ایک ہی جانب سے دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس کے چند روز بعد ساریہ کا قاصد اُن کا خط لے کر آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ ایرانیوں سے ہم سے جمعہ کے دن مقابلہ ہوا۔ ہم اُن سے لڑ رہے تھے کہ جمعہ کی نماز کا وقت آگیا۔ ہم نے دو تین بار ایک بیکار نیوالے کی آواز سنی کہ ”یا ساریۃ الجبل“ اور ہم پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اس کے بعد ہم دشمنوں پر برابر غالب ہوتے رہے یہاں تک کہ خدا نے اُنھیں شکست دی اور وہ قتل ہوئے۔

اس جنگ میں مسلمانوں نے دیگر مال غنیمت کے ساتھ ایک صندوق

یا یا جس میں جواہرات بھرے ہوئے تھے سب نے وہ صندوق حضرت ساریہ کو دے دیا۔ ساریہ نے اس کو حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھجوا دیا جس وقت قاصد اُسے لے کے بارگاہ خلافت میں پہنچا تو حضرت عمرؓ کا کھانا کھا رہے تھے۔ آپ نے قاصد سے کہا بیٹھو کھانا کھاؤ۔ جب کھانا کھا کے اُٹھے تو وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ آپ نے خیال کیا کہ اس نے ابھی سیر ہو کے نہیں کھایا ہے تو آپ اُسے اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گئے۔ اور کھانا دیا۔ ریتوں اور نمک لاکر دیکھ دیا گیا۔ دو دنوں نے مل کر پھر کھانا کھانے سے فرصت پا کے اُس شخص نے کہا "امیر المومنین میں ساریہ کا قاصد ہوں۔ آپ نے فرمایا "مرحبا" خوش آمدید پھر آپ اُس کے پاس گھٹنے سے گھٹنا ملا کے بیٹھ گئے۔ اور مسلمانوں کی خیریت پوچھی۔ اُس نے حالات بیان کیے۔ اور صندوق کا واقعہ کہا۔ اس کو سن کے آپ چلائے اور فرمانے لگے کہ اس کو میں نہیں لون گا۔ اسے رکھ لو جب وہ لشکر واپس آئے گا تو یہ اُنھیں لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اُس نے عرض کیا "امیر المومنین میرا اونٹ کمزور ہو گیا ہے اور مال قیمت کے بھروسے پر میں قرضدار ہو گیا ہوں۔ اس میں سے کچھ مجھے مرحمت ہو جائے تو میں دوسرا اونٹ خرید لوں۔ آپ نے اس کا اونٹ صدقہ کے اونٹوں میں سے بدلوادیا۔ وہ واپس جانے لگا تو دینے کے لوگوں نے اُس سے پوچھا کہ تم نے جنگ کے دن کوئی آواز سُنی تھی۔ اُس نے کہا ہاں۔ ہم نے سنا "یا ساریہ الجبل" اس وقت ہم سب ہلاکت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ مگر جب ہم نے یہ آواز سُنی تو ہار پر چڑھ گئے۔ اور اس تدبیر سے خدا نے ہمیں کامیاب اور فقیہ کیا۔

سیریلو

حرم۔ یہ زمانہ لٹریچر کا ماہوار رسالہ ہے جس کی ایڈیٹر ڈاکٹر بیگم عبدالغفور صاحبہ لیدی اڈاکٹر۔ ایل ایم۔ پی۔ ہیں جو نہایت ہی توجہ سے اسے مرتب فرماتی ہیں

اس وقت اس کا بجائی نمبر ۶۰۰ بابتہ ماہ اگست دسمبر ۱۹۲۶ء ہمارے سامنے ہے جس میں عورتوں کے مضامین کے علاوہ مشاہیر مردوں کے بھی متعدد مضامین ہیں کاغذ سفید لکھائی چھپائی عمدہ تقطیع و تہہ اور حجم ان دو نمبروں کا ۸۴ صفحہ ہے۔ قیمت تین روپیہ سالانہ ہے جو پیشگی وصول کی جاتی ہے۔ یہ قیمت اس رسالے کے اجرا کے اس مقصد پر نظر ڈالتے ہوئے کہ اس سے جو کچھ آمدنی ہوگی وہ غریب اور بیمار عورتوں کے علاج پر صرف کی جائے گی کسی طرح زائد نہیں ہے۔ اس رسالے میں دیگر مضامین نگاروں کے علاوہ جناب علامہ مولوی محمد عبدالودود صاحب بریلوی اور جناب شیخ عبداللہ صاحب بی اے ایل ایل بی اور جناب نذر سجاد حیدر صاحب کے ایسے مشاہیر اہل قلم کے کلمے ہوئے مضامین ہیں۔ ناظرین ذیل کے پتہ سے طلب فرمائیں۔

ڈاکٹر بیگم عبدالغفور صاحب۔ ایل ایم بی۔ محلہ تھان پٹی بھیت۔

ڈاکٹر۔ یہ ہو میو پیٹھی کا ایک دلچسپ رسالہ ہے جس کے ایڈیٹر جناب ڈاکٹر نظام الدین صاحب۔ ایم بی۔ ہو میو ہیں۔ اس رسالے کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ علاج ہو میو پیٹھی سے ہر خاص و عام واقف ہو جائے۔ مریضوں کے اسباب اور اس کا طریقہ علاج بہت خوبی سے درج کیا جاتا ہے۔ ۱۸ x ۲۲ کی تقطیع کے ۸۴ صفحات ہوتے ہیں۔ اور چندہ سالانہ صرف ۴ روپے۔ نمونہ کا پرچہ بلا قیمت روانہ ہوتا ہے۔ خریداری کے واسطے پتہ ڈاکٹر پوسٹ بکس نمبر۔ لاہور کے پتہ پر مراسلت کی جائے۔



(مولانا مولوی محمد عبدالحمید صاحب شہر مرحوم و مغفور)
 ذیل کا مضمون مولانا مرحوم کا ایک کچھ ہے جو آپ نے انگلستان سے واپس
 تشریف لانے کے بعد ہی قید رآباد کے ایک بہت بڑے جلسے میں ارشاد
 فرمایا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے اور مضمون کی مناسبت کے لحاظ سے
 قید رآباد و دکن کے مرحوم رسالہ معلم نسوان میں شائع ہوا تھا۔ میں مولوی
 صاحب حسین صاحب ایڈیٹر رسالہ معلم نسوان کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں
 نے اپنی مہربانی سے اس مضمون کی ایک نقل مجھے مرحمت فرمائی۔ میں اب اسے
 صرف اس غرض سے شائع کرتا ہوں کہ مولانا مرحوم کا اس قسم کا کلی متفرق لکچر
 دگلڈز کے صفحات پر جمع ہو جائے۔ اس کے علاوہ دگلڈز کے ناظرین میں سے
 بہت کم ہوں گے جنھوں نے اسے دیکھا ہو۔

آخر میں ایک بات مجھے خاص طور پر عرض کرنی ہے کہ اسے پڑھتے وقت
 اس بات کو ضرور مد نظر رکھا جائے کہ یہ اب سے تیس سال قبل لکھا گیا تھا
 اور اس وقت میں اور اب میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ اس میں
 تیس سال قبل کی انگلستان کی عورتوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر نظر
 آ جائے گی۔

محمد صدیق حسن ایڈیٹر

جناب پریسڈنٹ اور حاضرین جلسہ میں آج اپنے بعض معزز اور پرچوش دوستوں

کی خواہش کے مطابق انگلستان کی عورتوں کے متعلق کچھ حالات بیان کرنے اور اُن کے طرز عمل اور معاشرت پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی غرض سے کھڑا ہوا ہوں جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ ایک نہایت ہی نازک و دشوار سبککٹ ہے۔ بات یہ ہے کہ اخلاق انسانی میں سے جو اوصاف کہ نظام عالم کے قائم رہنے اور دنیا میں ایک بے ضرر زندگی بسر کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تو ہر ملک اور ہر قوم میں قریب قریب متحد ہیں۔ چوری سب جگہ منع ہے۔ زنا کاری ہر جگہ حرام ہے۔ فریبی اور کیا دہر جگہ ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر وہ اوصاف جن کو دنیا میں بود و باش کرتے۔ باہم ملنے جلنے۔ اور شادی بیاہ کی تقریبوں سے تعلق ہوتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ہر جگہ بدلے ہوتے ہیں۔ اور یہی چیزیں ہیں جن کا اعتبار سے ہر قوم کچھ اپنی خاص عادات و اطوار رکھتی ہے۔ اور یہ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن پر فلسفہ اور تہذیب کا بہت کم اور دیدہ میں اثر پڑتا ہے۔ بلکہ تمدن اور حکومت میں ترقی ہونے کے بعد ہر قوم کی عموماً ایسی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے طرز عمل اور طریقہ زندگی کو شائستگی کا معیار قرار دے۔ چونکہ یہ معیار کسی فلسفی اصول اور عقلی استدلال پر نہیں قائم کیا جاتا ہے لہذا دوسری قومیں اُس کی پیروی میں بھی اتنی پیش قدمی نہیں کرتیں جتنی کہ کسی سائنس اور فلسفہ کے اصول کے اختیار کرنے یا عام اصول اخلاق کے اخذ کرنے کے لیے سرگرمی دکھاتی ہیں۔ اس اصول کو آپ خود اپنے ملک میں دیکھ رہے ہیں کہ مغربی فلسفہ قریب قریب سارے ہندوستان کا مذہب ہو گیا اور ہوتا جاتا ہے۔ جدید سائنس جو یورپ سے آیا ہے۔ اس میں ترقی کرنے کا کون ہے۔ جو مشتاق نہیں۔ مگر انگریزی طرز معاشرت آج بھی ہندوستانی گھروں کے دروازوں سے اتنی دور ہے جتنی دور کہ سو برس پہلے تھا۔ یہ انگریزوں کی حقیقی معاشرت نہیں ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے بہت سے دوست کوٹا پبلون پہنے ہوئے ہیں۔ یا اکثر اہل اسلام اور ہموطنوں کی جسم پر شہزادان ہیں جو انگریزی ہی وضع کی متابعت میں ایجاد کی لیکن یا اُس سے بھی بڑھ کر کہہ دیا جائے کہ بعض ہندوستانی شریف زادیاں انگریزی گون پہننے لگی ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ انگریزوں کی معاشرت ہے۔ ان کی حقیقی معاشرت یہ ہے کہ عورتیں کس حال میں رہتی ہیں۔ اور اُن کے مرد اپنی عورتوں میں اور اپنے گروں کے اندر کیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں شادی بیاہ میں کیا ہوتا ہے۔ اور

شادی کیونکر موتی ہے۔ بچہ کیونکر پرورش پاتے ہیں۔ اور دنیاوی معاشرت میں مرد کے فرائض منصبی کیا ہیں۔ اور عورت کن کن کاموں کی ذمہ دار ہے۔

آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان باتوں میں آپ کی معاشرت یوروپین معاشرت سے اس وقت تک بالکل جدا ہے۔ طرز معاشرت کا اتنا کٹا ہوتا ہے کہ اپنی معاشرت کی خوبیاں دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ اور انسان تمام دوسری قوموں کی زندگی کو اپنے خیال میں بالکل جانوروں کی زندگی سمجھ لگتا ہے۔ اس کا تعصب انسان کے دل میں مذہبی تعصب سے بھی کسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسری قوم کی معاشرت میں کوئی امر تسلیم کرے یہ درکن اس کے طریقہ زندگی کو صحیح طور پر سمجھ چکی نہیں سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ انگریز سو برس تک ہندوستان میں رہنے کے بعد بھی ہندوستانی معاشرت کی بعض مسلمہ خوبیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح بہت کم ہندوستانی ہیں جو انگریزوں کی معاشرت کو اچھی طرح جانتے ہوں اور اس وجہ سے یہ خیال ہے کہ انگریزوں کی معاشرت اور خاصہ معاشرت کا وہ حصہ جو اس ترقی یافتہ قوم کی عورتوں سے تعلق رکھتا ہے مشکل ہے کہ آپ کو پسند آئے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اس مخالفت و نفرت کے دونوں طرف میں تفتیش حالات کا شوق نیکہ ان پاتا ہوں۔ جس طرح آپ انگلش عورتوں کے حالات سننے اور معلوم کرنے کے مشتاق ہیں اس سے زیادہ مشتاق میں نے انگریزوں کو اور خاصہ وہاں کی عورتوں کو پایا جو ہر وقت اپنی ہندوستانی بہنوں کے حالات ہی پوچھا کرتی ہیں۔ مذکورہ بالا اختلاف مذاق کی دشواری کو علاوہ ہندوستان میں انگلش معاشرت اور خاصہ وہاں کی عورتوں کی نسبت بہت سی بے سرو پا تین مشہور ہیں اور اس قدر مشہور ہیں کہ دونوں پر نقش ہو گئی ہیں۔ مجھے مشکل نظر آتا ہے کہ ان بے بنیاد واقعات و حالات کے خلاف میں کچھ بیان کروں تو بایہ قبول کو پہنچے۔

اس سے پیشتر ایک لکچر میں میں انگریزوں کی بہت سی اخلاقی باتوں کو ظاہر کر چکا ہوں

عہ اس لکچر کے متعلق میں نے بہت دریافت کیا۔ مگر بالکل پتہ نہیں چلتا۔ ممکن ہے کہ شائع ہونا ہوا ہو۔ یا مولانا مرحوم مغفور نے بغیر لکھنے زبانی ارشاد فرمایا ہو۔

محمد صدیق حسن

اگرچہ ان باتوں کو بھی انگلش معاشرت سے بہت کچھ تعلق تھا لیکن وہ اس قسم کے امور تھے جن کی خوبی کو غالباً ہر شخص نے تسلیم کر لیا ہو گا۔ اور جائز ہے کہ بغیر وجہ اور اسباب دریافت کیے اُن باتوں پر ہر ہندوستانی شخص آنکھیں بند کر کے عمل کر لے گا۔ آج چونکہ بین انگلش عورتوں کے حالات ظاہر کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں لہذا اس حصہ معاشرت سے بحث کرتا ہوں جس کو زیادہ تر رسم و رواج سے تعلق ہے۔ اور ضرور نہیں کہ ان میں سے ہر بات کی پیروی اور پابندی بھی کی جائے۔

اس موقع پر مجھے ایک اہم تاریخی واقعہ کے پیش کرنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بغیر اس کے بیان کیے۔ دنیاوی معاشرت کا مسئلہ اچھی طرح حل نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ جس وقت خدا کا خاص دین یعنی اسلام روت زمین پر ظاہر ہوا ہے۔ اس وقت کہہ زمین کے مشرقی رخ یعنی ایسٹرن ہمسفر کے اس تمام حصہ پر جو ہندوستان کے مغربی حدود سے لے کر انتہائے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ صرف دو قوموں کی معاشرت کا اثر پڑا ہوا تھا۔ ایرانیوں کا جو زرتشتی مذہب کے پابند تھے اور رومیوں کا جو چند ہی صدی پیشتر سے دین مسیحی کو اختیار کر چکے تھے۔ اگرچہ یہودیوں کی قوم ایک خاص قسم کی خصائص قومی رکھتی تھی۔ مگر مسیحیت ہم سے پہلے ہی اُس کا اثر مٹا چکی تھی۔ فتوحات اسلام کے بعد زرتشتی مذہب کے ساتھ اُنس کی معاشرت بھی مٹ گئی۔ اور اسلامی معاشرت جو مذہبی احکام عرب کے قومی خصائص اور ایرانیوں کے اس اثر سے جو عبا سہ کے دربار پر وقتاً فوقتاً پڑتا رہا مرکب تھی یورپ کے سوا تمام حصہ زمین پر اثر کر گئی۔ صرف ہی نہیں ہوا کہ مسلمان قوموں ہی میں اس معاشرت کا رواج ہوا ہو۔ نہیں اُن غیر قوموں پر بھی اس کا اثر پڑا جو حکومت اسلام کے تابع ہیں۔ اگرچہ مختلف ملکوں کی آب و ہوا اور حقیقی حاجتوں نے ہر سرزمین کے مسلمانوں میں بھی بعض خاص قسم کے رسم و رواج جاری کر دیے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کو اخلاق میں چاہے وہ کسی حصہ زمین پر ہوں ایک گونہ مشابہت و موافقت پائی جاتی ہے۔ مسلمان ہی نہیں وہ غیر قومین بھی جو اُن کے پاس آباد ہیں یا اُن کے ماتحت رہ چکی ہیں اپنے عادات و اطوار میں مسلمانوں کی بہت سی باتیں پائیں گی۔ ہر تقدیر ظہور

اسلام کے چند ہی روز بعد نظر آگیا کہ ساری دنیا پر اسلامی اور عربی معاشرت کا پورا اثر بڑا ہوا ہے۔ مگر تو پر جہاں دین بھی کا قدم بہت مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ ہماری معاشرت سے بالکل متاثر نہ ہو سکا جس طرح اسلام کی اس تیرہ سو برس کی زندگی میں مذہبی حیثیت سے گراں اور کہ سنٹ یعنی صلیب و ہلال لڑتے رہے ہیں۔ اسی طرح ان دنوں کی معاشرت بھی باہم ایک دوسرے کی حریف رہی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم انگلستان کی معاشرت کو اس قدر علیحدہ اور دور پاتے ہیں کہ ان کی کوئی بات اور کوئی رسم ہماری باتوں اور رسموں سے نہیں ملتی ہی پر وہ کا مسئلہ ہے کہ (معائنہ) پیچھے میں اس موقع پر اس مسئلہ کے حل کرنے کے لیے نہیں کھڑا ہوا ہوں کہ پورے کا ثبوت شریعت اسلام سے ہوتا ہے یا نہیں (عورتوں کو پردے میں چھپنا چاہیے یا یہ بھی طور پر تباہی عہد قدیم کی کئی اور قوموں میں بھی پایا جاتا ہوا یا نہ پایا جاتا ہو۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس رسم کو اسلام نے یہاں تک اختیار کیا کہ ہر حصہ زمین پر مسلمانوں کا کیریکٹر شک یعنی خصیصہ معاشرت ہو گئی۔ اور مسلمانوں کی وجہ سے ان تمام مشرقی قوموں میں جن پر مسلمانوں کے معاشرت کا اثر پڑا ہے۔ ہر خاندان کا معیار شرافت یہی قرار پا گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان درکنار ہندوستان میں اور چند روز پیشتر گجرات کے پارسیوں تک میں یہ خیال موجود تھا کہ جس خاندان کی عورتیں جہاں تک زیادہ غیروں اور ناچرمون سے چھپتی ہیں اسی قدر وہ خاندان زیادہ شریف اور ممتاز ہے۔ اسی طرح طہارت و نجاست کا مسئلہ ہے کہ دنیا کے جن جن حصوں پر اسلام کا اثر پڑا ہوا ہے ان میں طہارت کا وہی مفہوم اور وہی طریقہ ہے جو مسلمانوں میں مروج ہے۔ آپ اس پر فخر نہ کریں۔ اس لیے کہ زمانہ کی رفتار کا یہی تقاضا ہے۔ میں یہ بھی دکھا سکتا ہوں کہ بہت سی مسلمان قومیں جو مدت ہائے دور از تک عیسائیوں کے پڑوس میں رہی ہیں ان پر ان کا پورا پورا اثر پڑا ہوا ہے۔ جنوبی حصہ روس کے مسلمان جو مغلوں کے ساتھ صدیوں تک عیسائیوں میں رہے ہیں ان کی عورتوں میں بالکل پردے کا رواج نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ انگلش طرز معاشرت وہ خالص رومی یا عیسائی طرز معاشرت ہے جس پر کسی امر و کسی رسم میں آپ اپنا اثر نہ پائیں گے۔ آپ اپنے قرب و جوار کی تمام

قوموں اور ان کی عورتوں میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور پالین گے جو آپ کے مذاق کے موافق ہے۔ اور جس کے اعتبار سے آپ اپنے خیالی کی شرافت کا قہور اساتھ ان کو بھی دیدین گے گریورپ کی توہین اور وہان کی عورتیں جس وضع کی زندگی بسر کر رہی ہیں وہ آپ کے معیار شرافت سے اس قدر جدا جاتی ہے اور یہاں تک علیحدہ رہتی ہے کہ مشکل ان مغربی خاتون کو آپ کی زبان سے کوئی تعریف کا لفظ نصیب ہوگا۔ تاہم زمانہ اب دنیا کی تمام قوموں کو ایک ہی ایٹم پر لا رہا ہے۔ اور بتاؤ وہ خیالات کے ساتھ قوموں میں باہمی تبادلہ مذاق و عادات بھی ہو رہا ہے۔ لہذا میں کہاں ادب عرض کرتا ہوں کہ ان کی معاشرت کو ایک مسلمان کی نظر سے نہیں بلکہ ایک حکیم یا فلسفی یا ایسے شخص کی نگاہ سے دیکھئے جس کے دل پر کسی خاص مذاق اور معاشرت کا اثر نہ پڑا ہو اور وہ ساری دنیا کی قوموں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہو۔ اگر آپ ان کی زندگی کو ایسی صاف اور سادی نگاہ سے دیکھیں گے تو بہت سے فائدہ اٹھا سکیں گے اس لیے کہ دنیا کی کوئی قوم نہیں جس میں صرف برائیاں ہی برائیاں ہوں ہر جگہ برائیوں کے دامن میں خوبیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اور آپ کی تو اسلامی شان یہ ہونا چاہیے کہ ”الحکمۃ صلاۃ المؤمنین فہو احسن حیث وجدھا“ کسی تاریخی کتاب میں دیکھنا تو مجھے یاد نہیں مگر میں نے بعض لائق احباب کی روایت سے سنا ہے کہ پہلے پہل انگریز جب ہندوستان کے ساحل پر اترے تو ان کو عورتوں کے نہ ہونے یا بہت کم نظر آنے پر تعجب ہو گیا اور خیال کر رہا کہ شاید اس ملک میں عورتیں نہیں ہوتیں۔ بخلاف اس کے انگلستان کے ساحل پر قدم رکھتے ہی ایک مشرقی شخص کو جو سب کے پہلے قابل حیرت چیز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کم ہیں اور جدھر دیکھیے زیادہ عورتیں ہی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ عورتیں بھی کوئی سمجھتی ستم کی نہیں۔ یہ اما اصبیلین اور مرد و زنانہ نہیں جو آپ کو بیان بھی مردوں کے غول میں ملی جلی نظر آ جاتی ہیں بلکہ وہ شریف عورتیں جو اپنے گھروں کا تریور اور اپنی قوم کی عزت ہیں اور جن کے شوہر آج اقصاء عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور ملکوں پر ملک فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے لباس کے متعلق آپ کو میرے پہلے ہی لکھنے بتا دیا ہو گا کہ کس قدر صاف اور ستھر ہے۔ گراس موقع پر مجھے اس قدر زیادہ کہنا چاہیے کہ اس میں انتہا درجہ کاناٹ

اور حد درجہ کی جدت بھی پائی جاتی ہے۔

اُن عورتوں میں زیادہ حصہ تو ان کا ہے جو سودا سلف لینے کے لیے بازار میں آتی ہیں۔ ان کے بعد ان کا نمبر ہے جو کارخانوں یا اپنے آفسوں اور دفتروں میں کام کرتے جاتی ہیں بعض جگہ وہ کم بین لڑکیاں دکھائی دین گی جو اسکولوں کو جا رہی ہیں۔ اور بعض جگہ وہ خادما میں نظر آئیں گی جو صاف اور براق ایرون یعنی وہ کپڑا جو لباس کے صاف رکھنے کے لیے کمرین لپیٹ لیا جاتا ہے۔ باندھ کسی دکان کی طرف دوڑی جاتی ہیں۔ اور انھیں کے غول میں ایک آدھ ایسی لڑکی بھی نظر سے گزر جائے گی۔ جو نیڈلن یا اور کوئی باجہ ہاتھ میں لٹکائے اپنے موسیقی کے استاد کی طرف چلی جا رہی ہے۔ انھیں عورتوں کے غول میں آپ کو بعض وہ نو عمر سیاں بی بی یا سنگتر بھی ملین گے جو بی بی یا معشوقہ کا ہاتھ ہاتھ میں لے کے ٹھیلے کو نکلتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی باتوں میں مشغول نہایت ہی آہستگی سے قدم اٹھاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور آخر میں آپ افسوس کے ساتھ کبھی کسی بچہ اس عورت کو بھی پائیں گے جو ٹرکوں پر اپنی قسمت ڈھونڈھنے کو نکلی ہے بعینہ اسی طرح جس طرح کہ آپ اپنی ٹرکوں پر ہر مذاق ہر خیال اور ہر قسم کے چال چلن کے مرد و زن کو دیکھتے ہیں اسی طرح آپ وہاں کی ٹرکوں پر ہر قسم ہر مذاق کی عورتوں کو دیکھیں گے اور اس کے ساتھ آپ کو اپنے خیال اور اپنے مسلمات کے خلاف یہ ہی نظر آئے گا کہ جس طرح آپ کی ٹرکوں پر ہر قسم اور ہر وضع کے لوگ مل جمل جانے کے بعد پھر بھی اپنی اپنی وضع پر قائم رہتے ہیں اور ایک کا دوسرے پر اثر نہیں پڑتا۔ یعنی شریف شریف ہی باقی رہتے ہیں اور پاجی پاجی ہی اسی طرح وہاں کی عورتیں باوجود اس کے کہ سب ایک ہی ٹرک پر گزرتی ہیں۔ مگر جو جس وضع اور رفتار کی ہیں اپنی اپنی وضع اور رفتار پر قائم رہتی ہیں۔

لندن کی ٹرک کی ایک اجمالی تصویر دکھا دینے کے بعد اب مجھے ضرورت معلوم ہوئی ہے کہ عورتوں کے اصلی اور تفصیلی حالات سے آپ کو مطلع کروں۔ جس کے لیے مناسب ہے کہ سب کے پہلے میں یہ بتا دوں کہ ایک لڑکی کی زندگی ابتدا سے انتہا تک کس وضع کس حالت اور کن اصول پر گزرتی ہے۔ بچپن ہی سے وہاں کی لڑکیوں کی زندگی آپ کی لڑکیوں سے بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ آپ کو شاید یہ سن کے تعجب ہو گا کہ وہاں حسن و عشق کی جذبات آپ کے مذاق کے خلاف جائز ہی نہیں! انسانی

زندگی کے لیے ضروری و لازمی تصور کیے جاتے ہیں۔ اور جان تک میں خیال کرتا ہوں وہاں ہر قسم کی تعلیم سے پہلے ہی لڑکوں اور لڑکیوں پر عاشق اور معشوق بننے کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ اسی وقت سے سکھا دیا جاتا ہے کہ لڑکا اگر لڑکی پر عاشق ہو تو کون الفاظ اور کن اشارات و حرکات سے اظہار عشق کرے۔ اور لڑکی کو بھی بنا دیا جاتا ہے کہ اگر اس پر کوئی اظہار عشق کرے تو وہ کیا کرے۔ اور کیونکر پیش آئے۔ اسی قدر نہیں اور اس کو ضمناً اس بات کی بھی تعلیم شروع ہو جاتی ہے کہ وہ کسی لڑکے کو اپنے دام محبت میں گرفتار کرنا چاہتے تو کن ادائوں سے کام لے اور وہ کون کون سے حرکات ہیں جو مرد کے جذبات عشق کو حرکت میں لاسکتی ہیں۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے بیان اور میں خیال کرتا ہوں کہ تمام اُن ممالک میں جن پر اسلامی معاشرت کا اثر بڑا ہوا ہے اس قسم کے امور بالکل خود رد ہوتے ہیں اور مرد عورت کو محض فطرت کی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں اور وہاں اس کے خلاف ان امور میں بھی انسانی کاریگری اور آرٹ کو بہت کچھ دخل ہو گیا ہے۔

انگلستان کی اس ابتدائی تعلیم کو میں کسی کے کہنے سننے یا روایت کی بنا پر نہیں بیان کرتا ہوں بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ان تمام باتوں کو میں نے خود اپنے ذاتی تجربہ سے اخذ کیا ہے۔ میں جس محلہ میں رہتا تھا اور جن لوگوں سے ملتا جلتا تھا ان میں سے اکثر لوگ اگرچہ وہاں کے رہنے والے تھے جن کی عورتیں عموماً انگریزی قوم کے مذاق میں شہر والوں سے زیادہ باعصمت اور پاک دامن خیال کی جاتی تھیں۔ مگر انہیں کے بچوں کی اس تعلیم کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا کرتا تھا۔ خود وہ پاکدامن عورت جس کی پاکدامنی اور عصمت شہری کا نقش کبھی میرے دل سے نہ مٹے گا۔ یعنی وہ عورت جس کے گھر میں مجھے ایک سال سے زیادہ زمانہ تک رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے دو چھوٹے بچے فرینکی اور جرد لڑکھو بصورت بچہ تھے اور بہت پیاری پیاری باتیں کرتے تھے۔ ایک کی عمر چھ برس کی اور ایک کی چار سال کی تھی۔ یہ دونوں بچے پڑوس کی دو لڑکیوں پر عاشق تھے۔ ان لڑکیوں کو جن کی عمریں بھی تین چار سال سے زیادہ نہ تھیں اپنے گھر میں لاتے اور کہتے کہ یہ ہماری سویٹ ہارٹ یعنی معشوقہ ہیں۔ یہ بچہ آپس میں بوسہ لینے اور لڑکیاں اُسی ناز سے اور اسی طرح انکار کے بعد بوسہ دیتیں۔

جس طرح کہ کوئی جوان اور بالغ لڑکی کرے گی۔ ان باتوں پر بوڑھے ہنستے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔ میں نے کبھی کبھی یہ بھی دیکھا کہ لڑکوں کی مان خود اپنے بچوں سے کہتی کہ اپنی سیوٹ ہارٹون کو بلا لاؤ۔ وہ لڑکیاں آتیں۔ اور ہم اُن کی اس معصومانہ محبت کے کھیل کو دیکھ کر خوش ہوتے۔

اسی طرح ایک مقام پر مجھے پندرہ روز تک ایک ایسی محبت میں رہنے کا اتفاق ہوا جہاں دس بارہ مرد اور آٹھ دس عورتیں ساتھ ہی رہتی تھیں۔ کھانا پینا ساتھ تھا۔ دن کو بھی اکثر صحبت رہا کرتی۔ اس محبت میں ایک چھوٹی پانچ چھ برس کی لڑکی بھی جو کئی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ ایک دن میرے یہ لڑکی ایک بوڑھے شخص کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی جن کی بی بی اُن کے دوسرے ہاتھ پر تھیں۔ یہ بوڑھے بزرگ ایک فوجی کیپٹن تھے۔ لڑکی کی مان نے چلا کے اپنی لڑائی سے کہا "کئی دیکھو تم کو کسی ایسے شخص کے پاس بیٹھنا چاہیے جو جوان اور کنوارا ہو۔ کیپٹن..... بیاہر ہوئے آؤمیں ہم تم نہیں دیکھتیں اُن کی بی بی دوسری طرف بیٹھی ہوئی ہیں" اس واقعے سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ خود مان ہی کئی گود سے ان باتوں کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اسی مکان میں ایک لڑکا تھا۔ ہیریٹ۔ جس کی عمر شاید دس برس کی ہو۔ یہ لڑکا دن رات اسی لڑکی کئی پر عشق ظاہر کرتا۔ دونوں رات کو بچھو لے پر جاتے وقت ایک دوسرے کا بوسہ لے کے جدا ہوتے۔ اور صبح کو ملنے ہی بوسہ لیتے۔ مگر لڑکی اور لڑکا دونوں کے والدین ان باتوں کو جائز بلکہ ضروری نہیں سمجھتے ہوئے تھے۔ مزاحم ہونا درکنار ملکہ ایسے موقع دیتے رہتے تھے کہ ان دونوں معصوم عاشقوں کو اظہارِ ذوق و شوق کی جرات ہو۔ جان تک میں نے اندازہ کیا میں سمجھتا ہوں کہ ایسی باتوں اور اس قسم کی تعلیم کی وہاں ضرورت بھی ہے۔ وہاں کی سوسائٹی میں مرد اور عورت دونوں کے لیے زندگی کا سب سے پہلا اور اہم مرحلہ ہی ہے کہ لڑکا کسی لڑکی کے دل کو جیت لے اور لڑکی اپنے لیے کوئی جاننا عاشق پیدا کر لے۔

علاوہ ازیں سوسائٹی میں جب مرد اور عورت ملتے ہیں تو وہاں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ مرد اور عورت دونوں بیباکی سے اور بغیر اس کہ لجا میں اور شرمین ہر قسم کے خیال کو جو اُن کے مذاق میں بخش نہ ہو بلکہ

اور جرأت کے ساتھ ادا کر جائیں۔ جس لڑکے اور لڑکی میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ دراصل وہاں کی محبت میں ملنے اور شریک ہونے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ آپ کے ہندوستانی لڑکے جو وہاں جاتے ہیں چونکہ بچپن سے اُن کے مذاق میں ایک شرم پیدا رہتی ہے لہذا وہاں کی سوسائٹی کے قابل کبھی نہیں ہو سکتے۔ عموماً یہ لڑکے اسے شرم کے غبار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور مشکل اسکی بھی جرأت کر سکتے ہیں کہ وہاں کی عورتوں میں نہ مکمل سکین۔ بخلات اس کے انگشت لڑکے اور لڑکیاں بچپن ہی میں اس قدر بیاک اور جبری ہوتے ہیں جتنے کہ آپ بڑھاپے میں بھی نہیں ہو سکتے۔ انگریزوں کی چھوٹی بچی سے بھی آپ اُس کی شادی کے متعلق کچھ پوچھیے تو وہ نہایت بیاکی اور منان سے جواب دے گی۔ اور اُس کے چہرے پر نام کو بھی لجا ہٹ نہ ہوگی۔ بخلات اس کے اگر آپ اپنے جوان بیٹوں سے بھی ایسا ہی کوئی سوال کیجیے تو وہ شراکے سر جھکا لیں گے۔ اصل یہ ہے کہ اس ملک کے مذاق میں یہ شرم عیب سمجھی جاتی ہے۔ اور آپ کے مذاق میں ایک حد تک ہنر۔ لیکن اس عشق اور محبت کے تعلیم کے ساتھ اُن کی عفت کا بھی بہت کچھ خیال رکھا جاتا ہے۔ آپ کو یہ سن کے حیرت ہو جائیگی اور شاید مشکل یقین آئے گا کہ بادیو وہاں تمام باتوں کے جن کو آپ اپنے مذاق میں انتہا درجہ کی بے عفتی خیال کرتے ہیں۔ وہاں کی لڑکیاں کثرت سے ایسی پاک دامن رہتی ہیں کہ سن بلوغ تک پونچنے بلکہ اس کے بعد بھی دو چار برس گزر جاتے تک اس سے بھی نہیں واقف ہوتیں کہ مرد اور عورت میں اصلی فرق کیا ہے۔ اور مرد کیوں مرد۔ اور عورت کیوں عورت ہے۔ حقیقت میں یہ ایک ایسی بات ہے کہ اکثر ہندوستانیوں کی سمجھ سے باہر ہے مگر اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ وہاں غوام اور بازاریوں تک کی زبان سے کبھی محض الفاظ اور ایسی غلیظ گالیاں نہیں سنی جاتیں جیسی کہ بیان ہر مرتبہ گھر سے باہر نکلتے ہی آپ سُن لیا کرتے ہیں۔ ہمارے بچے بچپن ہی میں ان ناپاک الفاظ کو سُرکون پر سنتے ہیں۔ اور اپنے دل ہی دل میں ان کے معنی سمجھنے کے متحسّس ہوتے ہیں۔ اور آخر اسکول دوستوں یا خدمتگاروں میں سے کوئی ایسا بھی مل جاتا ہے جو ان معاملات کو خوب حل کر کے بتا دیتا ہے اور محبت سکھ جاتا ہے۔ جذبات پیدا ہونے سے پہلے ان کو یہ ناپاک باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اور شاید

یہ اسی کا نتیجہ ہے جو مجھے انگلستان میں نظر آیا کہ بدکاری وہاں میں رسیدہ لڑکوں بلکہ بڑھوں میں زیادہ ہے اور یہاں تو عمر دن میں اور بعض تجرباتیہ مجھے ایسے محل ہوئے ہیں جن کی بنا پر میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے نابالغوں میں بھی۔

انگریزوں اسی قسم کی گھریلو تعلیم اور اسی طرح محبت کے کھیلوں میں لڑکیاں اس عمر کو پہنچ جاتی ہیں کہ اسکول بھیجی جائیں۔ اگرچہ لڑکیوں کے مدارس میں بقول ہمارے حیدر آبادی دوستوں کے ننھے ننھے مرد بچہ بھی لے لیے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہاں تو لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس جدا جدا ہیں۔ لڑکوں کے مدارس الگ ہیں اور لڑکیوں کے مدارس الگ۔ اس موقع پر مجھے اتنا کہہ دینا چاہیے کہ امریکہ والوں کو اس بارہ خاص میں اہل انگلینڈ سے اختلاف ہے۔ ان کے وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مدارس کی کوئی تفریق نہیں۔ اور جب دونوں میں بکری پیدا ہونے کا اندیشہ ظاہر کر کے اس تفریق کی ضرورت بتائی جاتی ہے تو امریکی الے کہتے ہیں کہ یہ اندیشہ بالکل بیجا ہے۔ اور وہ محبت بھی زیادہ سچی پائے اور قابل قدر ہوگی جس کو لڑکے اور لڑکیاں اسکول سے لے کے باہر آئیں۔ تاہم انگلستان والے اب تک مدارس کی جدا رکھنے کی ضرورت کو ماننے سے ملتے ہیں۔ اور آج تک یہ تفریق قائم ہے۔

اب مجھے یہ بتانا چاہیے کہ لڑکیوں کو وہاں تعلیم کن چیزوں کی دلائی جاتی ہے۔ اور اسی کے ذیل میں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہاں کی سوسائٹی میں عورت کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور انسانی معاشرت میں عورت کیا پارٹ لیتی ہے۔ جن جن علموں اور فنون کی تعلیم میں بتایا ہوں یہ صرف موجودہ سلسلہ تعلیم کی بنا پر ہے۔ مگر چند سال سے عورتوں میں اس قدر ترقی ہو گئی ہے کہ میرے خیال میں بہت جلد یہ کورس بدلا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ روز بروز عورتیں اپنے زیادہ حقوق اور دنیاوی اغراض میں اپنی زیادہ ضرورتیں ثابت کرتی جاتی ہیں۔ اس وقت تک عام طور سے لڑکیوں کو ابتدائی مدارس میں پڑھنے لکھنے جتنے پڑھنے۔ کاڑھنے۔ کھانے پکانے۔ قصور بکھینچنے۔ گانے۔ ناچنے۔ اور پتیا نو بجانے کی تعلیم دلائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ بعض قسم کی درزین بھی تعلیم کے ساتھ ضروری سمجھی

جاتی ہیں۔ ابتدائی تعلیم جس طرح لڑکوں کے لیے جبریہ ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کے لیے بھی ہے۔ جو ان بابا لڑکے یا لڑکی کو اسکول میں نہ بھیجیں تو اسکول کی درس کی رپورٹ پر باکسی اور کی خبر رسائی پر ان کو حرج بانہ وغیرہ کی سزا ہو جاتی ہے۔ ان مدارس میں تعلیم پانے کے بعد پھر لڑکیوں کو اختیار ہے کہ جس علم و فن کی طرف چاہیں تو جہ کریں۔ اور ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم لگا ہین خاص لڑکیوں کے لیے موجود ہیں۔ وہ کالجوں میں جاکے تی۔ آئے۔ اور کرایم۔ آئے۔ کی ڈگری پاس کر سکتی ہیں۔ ڈاکٹری کا اعلیٰ درجہ کا امتحان دے سکتی ہیں۔ یا سمری درجہ تک ماحول حفظ صحت اور طریقہ تیمار داری کو سیکھ کے کرس بن سکتی ہیں۔ یا بعض ڈیپارٹمنٹل امتحان پاس کر کے سرکاری خدمات حاصل کر سکتی ہیں۔ اس وقت تک چونکہ مرد وہاں عورتوں کو دوبارہ ہیں۔ اور عورتوں میں اس قسم کی ایک جس پسند ہو گئی ہے کہ وہ دبائی جاتی ہیں۔ لہذا طلب علم میں وہ لڑکوں اور مردوں سے زیادہ گرم جوشی دکھانے لگی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت تک طلبہ میں زیادہ شمار مردوں ہی کا ہے مگر وہ تھوڑی لڑکیاں بھی اس ذوق و شوق سے پڑھتی اور تعلیم پاتی ہیں کہ اکثر لڑکوں سے زیادہ تہرہ جاتی ہیں۔ صرف یہی نہیں جن محکمات میں عورتوں کو ملازمت دی جانے لگی ہے۔ ان میں عورتیں صرف اپنی لیاقت کا ثبوت دینے اور حقوق قائم کرنے کے لیے ایسی امانداری اور جفاکشی سے کام کرتی ہیں کہ عموماً رپورٹ میں عورتوں کی فیو ر اور طرفداری میں ہوتی ہیں۔ ڈاک خانہ اور تار برقی کے محکمہ میں زیادہ تر عورتوں کو جگہیں مل گئی ہیں۔ ان محکموں کی سالانہ رپورٹوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو جو دفتر عورتوں کے ہاتھ میں تھے ان میں بمقابلہ ان دفاتروں کے جو مردوں کے ہاتھ میں تھے۔ راست بازی اور محنت سے کام ہوا اور زیادہ کام ہوا۔ اور دیکھنے ہی سے کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ پھرتی اور چالاک اگرچہ وہاں ہر شخص کی طبیعت وغیرہ میں ہے۔ مگر جیسی پھرتی اور چالاک عورتوں کی رفتار و عادات سے ظاہر ہوتی ہے وہ مردوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔ عورتوں اور مردوں میں جو کہ ایک پبلیشن یعنی مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ لہذا نوع انسان کی ان فطری خصوصیات

میں باہمی تعصب شروع ہو گیا ہے۔ جو روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ جس کا ثبوت وہاں کے اُن اجاروں اور مردوں سے ہو سکتا ہے جو سو سالہ پیپر کھلانے ہیں۔ ان میں بہت سے رسالے مردوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اور بہت سے عورتوں کے ہاتھ میں۔ اور دونوں ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرتے رہتے ہیں۔ مگر میں کہوں گا کہ اس بارہ خاص میں بھی عورتوں کی رفتار بجا بلہ مردوں کے نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ہے جس سے کامیابی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اجارہ جو مردوں کے دکیل ہیں ہمیشہ عورتوں پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے عورتوں کے اجارہ زیادہ تر عورتوں کو ترقی پر آمادہ کرتے اور اُن کو ترقی کے راستہ بتانے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور بہت کم جواب دہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یہ تفریق وہاں مدت سے قائم ہو گئی ہے کہ بوجہ اٹھانے اور سخت جسمانی محنت کے کاموں کو عورتیں ہاتھ نہیں لگاتی ہیں۔ وہ زیادہ تر انھیں کاموں کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہیں جن میں زیادہ تر کھانا مقصود خاطر ہو۔ بخلاف اس کے تمام وہ کام جن کو سخت جسمانی محنت سے تعلق ہے سب مردوں کے ہاتھ میں ہیں۔ آپ کے بیان میں بالکل اس کا اُلٹا دکھتا ہوں اس لیے کہ یہاں کی عورتیں عام پر تو متعلیٰ ہیں مگر وہ بھی گئی ہیں اور جو چند کام کرتی ہیں تو ایسے سخت کہ مردوں سے بھی مشکل ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ نازان عورتوں کو دو دو در تین تین من کا بوجھ پیٹھ پر اٹھاتے ہوئے بیان کی طرح پر جانے دیکھ گئے یقین ہے کہ سیری طرح آپ کو بھی اکثر افسوس ہوا ہو گا۔ وہاں بالکل ایسا نہیں ہے۔ اول تو وہاں ہاتھ سے ٹھیلنے اور پاؤں سے چلانے کی گاڑیاں اس کثرت سے پھیل گئی ہیں کہ کوئی مرد بھی بوجھ اٹھائے ہوئے نہیں نظر آتا۔ لیکن اسٹیشن اور بندر گاہوں پر اس قسم کے کاموں کی تھوڑی بہت ضرورت باقی ہی رہ گئی ہے تو عموماً مردوں کے ہاتھ سے اجرا پاتی ہے۔ اس کے مقابل میں عام قسم کے جو کام عورتوں کے ہاتھ سے اجرا پاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ خدمتگاری کا کام عموماً عورتیں کرتی ہیں۔ دوکاندار ہی میں گاہکوں سے ملنا اور چیزوں کو چھاننا طور پر عورتوں کا کام ہے۔ چار خانوں اور عام قسم کے ہوٹلوں میں کل کام عورتوں ہی کے ہاتھ سے

اجرا پاتے ہیں شراب پلائیوالبان سب عورتیں ہیں بڑے بڑے کارخانہ داروں میں جو کام تھوڑی محنت سے اور جلد کرنے کے یا ایک جگہ بیٹھ کے کرنے کے اور نیز وہ کام جن کو صفائی اور ستھرے پن سے تعلق ہے سب عورتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ کام پہلے عموماً مردوں کے ہاتھ میں تھے۔ مگر تدریجاً سب جگہ سے مرد نکل گئے اور عورتیں ان کے قائم مقام ہو گئیں۔ اس کی زیادہ وجہ اول تو یہ ہے کہ جن کاموں میں پھرتی اور چالاک کی کو دخل ہوتا ہے۔ ان میں اکثر عورتیں مردوں سے غالب رہتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے مزاج میں صفائی مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہر چیز کو صاف رکھنا جیسا عورتیں جانتی ہیں مرد نہیں جانتے۔ اور تیسرا اور سب سے قوی سبب یہ ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں بہت کم تنخواہ پر رہتی ہیں کارخانہ داروں کو جتنی کفایت عورتوں کے رکھنے میں پڑتی ہے۔ اتنی مردوں کے نوکر رکھنے میں نہیں پڑ سکتی۔ اس کے اسباب پر بھی میں نے بہت غور کیا۔ اور آخر غور کرتے کرتے اور دماغ کی لائف کا تجربہ اٹھاتے اٹھاتے اصل وجہ کا پتہ لگ گیا۔ بات یہ ہے کہ مردوں کے سر عموماً اپنے ساتھ بی بی بچوں کا بھی بار ہوتا ہے۔ اور عورتیں جو کام کر دیتی ہیں عموماً کنواری سہیں ہوتی ہیں۔ ان کو سوا اپنی ذات کے اور کسی کی فکر نہیں ہوتی یہاں مشہور ہے کہ گلستان میں مرد کم شادی کرتے ہیں۔ اعلیٰ اور ذریعہ مالی طبقہ میں ایک حد تک اس کو مان لوں گا۔ مگر عام لوگوں کا حال بالکل اس کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ بہت کم ایسے مرد ہوتے ہیں جن کی شادی نہ ہوئی ہو۔ قطع نظر اس کے وہاں اور شاید یہاں بھی یہ عام قاعدہ ہے کہ مرد جو شادی نہیں کرتے ان میں سے زیادہ اکثر ایسے ہوتے ہیں جو کسی عورت سے ناجائز تعلق رکھتے ہوتے ہیں ان کے سر جائز بی بی سے زیادہ اور بدرجہا زیادہ بار ایک ناجائز مشوقہ کا ہوتا ہے۔ بخلاف عورتوں کے کہ جتنی کنواری ہیں ان میں سے بکثرت بلکہ قریب قریب کل ایسی ہوتی ہیں کہ حقیقت میں کنواری ہوتی ہیں۔ اور سو میں چار پانچ اگر آوارہ بھی ہوتی ہیں تو بچے اس کے کہ مرد کو کچھ دین تھوڑا بہت اس سے اور وصول کر لیا کرتی ہیں۔ علاوہ ان میں اگر کسی عورت کے حرام سے بچہ بھی ہو جائے تو وہاں کا قانون بچہ کے پرورش کے مصداق

اسی شخص سے دلوانا ہے جس کا نطفہ ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت کے کوئی بچہ ہو تو بھی وہ اس کی پرورش کے بار سے بکدوش رہتی ہے۔

ان تمام کاموں کے بالاستقلال اپنے ہاتھ میں لے لینے سے اگر عورتوں کو کوئی چیز رکھ سکتی تھی تو وہ وضع حل اور ایام رضاعت کا زمانہ تھا اس کی جتنی ہی معقول تدبیر ہو گئی ہے کہ اول تو جب سے سوس راک جس کو آپ اپنی اصطلاح میں ڈبلے کا دودھ کہتے ہیں جاری ہوا۔ وہ ان کے امیر و غریب اور قریب و قریب ساری عورتوں نے دودھ پلانا چھوڑ دیا۔ صرف بچہ کا گود میں لیے رہنا رہ گیا تھا اس کا یوں انتظام کر دیا گیا کہ اس قسم کے خاص خاص مکانات اکثر محلوں میں جاری کر دیے گئے ہیں۔ جن میں بچوں کے پالنے کے لیے دایمان کو رکھتے ہیں۔ اور جو عورت اپنا بچہ اور اس کے ساتھ چھ پنس جو آپ کے آٹھ آنے کے برابر ہوتا ہے دے دیتے جاتے اس کا ایک صبح سے شام تک پوری نگرانی کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ اور دن بھر اس کو جو دودھ پلایا جاتا ہے اس کی قیمت بھی انھیں چھ پنس میں شامل ہے۔ ان مکانات کے جاری ہونے سے یہ آسانی ہو گئی ہے کہ ہر عورت ایک ہفتہ کی رخصت لے کر وضع حل سے فراغت کر لیتی ہے۔ اور اس کے بعد سے روزانہ کارخانہ جاتے وقت اپنا بچہ انھیں مکانون میں دایمان کے حوالے کر دیتی ہے۔ اور شام کو گھر آتے وقت لے لیتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان عام لوگوں کا تذکرہ بیان کرنے کے لیے میں اصلی تعلیم کے بجائے سے بہت دور جا پڑا۔ یہ اوپر بیان کر چکا کہ عموماً تعلیم کن چیزوں کی دلائی جاتی ہے۔ اور ابتدائی تعلیم کے بعد جو انسانی ضرورت کے لیے لازمی سمجھی گئی ہے۔ عورتیں کن کن بھجکوں میں ترقی کر سکتی ہیں۔ اور ہر امر میں ترقی کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے مرد چونکہ پہلے سے اس قدر ترقی کر چکے تھے کہ پڑھا لکھا آدمی ہر کام اور ہر پیشہ کو کرتا اور کر سکتا تھا لہذا ہندوستان کے مردوں کی طرح وہ ان عورتوں کی تعلیم نے یہ خرابی نہیں پیدا کی کہ ہر پڑھا لکھا آدمی اسکول سے نکلے ہی تعلیم اور نوکری کی طرف متوجہ ہو جائے اور اپنے قدیم پیشہ کو چھوڑ دیے۔ شاید یہ دشواری وہ ان کے مردوں میں تعلیم کے رواج پذیر ہونے کے وقت پیش آئی ہو۔ لیکن عورتوں نے تعلیم ہر کام کے کرنے سے شرم اور عاجزی ظاہر نہیں کی۔ وہ بڑھنے کے بعد بھی اپنے انھیں کاموں کو کرتی رہیں

جن کو پہلے کرتی تھیں۔ اور جب انھوں نے خود کمانے اور اپنے قوت بازو سے روپیہ پیدا کرنے کی طرف توجہ کی تو ہر کام اور ہر پیشہ کو جو عورت کے مناسب ہو سکتا ہو اختیار کر لیا۔ اور جو خانہ داری کے کام پہلے سے کر رہی تھیں ان کو زیادہ طاقت و دانائی سے کرنے لگیں۔

وہ علمی مذاق اور دماغی کام جن کو دنیا کی تمام گزشتہ عمر میں مردوں نے اپنے ساتھ مخصوص رکھا تھا اور عورتوں کو یہاں تک اُن کاموں سے علیحدہ کر دیا تھا کہ عورتوں کی جہالت اور کم فہمی صرف آپ ہی کے بیان نہیں یورپ اور خاص طور پر انگریزوں میں بھی ضرب المثل ہو گئی تھی عورتوں نے صرف اپنی کوشش اور بے انتہائی ترقی سے غلط اور بے اصل ثابت کر دیا۔ آج آپ وہاں جاکے دیکھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ علمی ذوق اور دماغی نازک خیالی میں عورتیں کسی درجہ مردوں سے کم نہیں ہیں آپ وہاں دفاتروں اور کھٹے پڑھنے کے کاموں میں عورتوں کو اسی طرح سی پڑھیا پائیں گے جس پر آپ نے سوا سے مرد کے کبھی عورت کو دیکھا ہی نہیں۔ برٹش میوزیم کا کتب خانہ جو صرف عالی دماغ مصنفوں کے لیے کھولا گیا ہے۔ وہاں مردوں کے برابر ہی آپ عورتوں کو بھی مطالعہ کتب میں مشغول اور منہمک پائیں گے۔ اور میں تعجب اور حیرت کے ساتھ دیکھتا تھا کہ وہ کتابیں قرض دینے والی لبریریاں جن کی شاخیں انگلستان کے ہر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی کھلی ہوئی ہیں اُن سے زیادہ فائدہ اٹھانے والی عورتیں ہی تھیں تصنیف و تالیف کا سلسلہ عورتوں نے بھی جاری کر دیا اور اُن کی چند ہی روز کی توجہ کا نتیجہ ظاہر ہو گیا کہ عام خیال قائم ہو گیا ہے کہ عورتیں مردوں سے اچھی ناولسٹ ہوتی ہیں۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔ اس لیے کہ ناول نگاری کا دار و مدار ایک نوزبان پر ہے اور دوسرے ان باتوں میں بصیرت ہونے پر جن کو خانہ داری اور معاشرت سے تعلق ہے اور ان دونوں میں عورتانہ فطرت مرد سے اچھی ہوتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی عورتیں ناول نگاری میں مہتمم مردوں کو شکست اور فاش شکست دیا جا رہی ہیں۔ صدائے عورتیں ایسی ہیں جو مصنفین نگاری اور اخباروں کی ایڈیٹری پر زندگی بسر کر رہی ہیں۔



(از جناب لطافت حسین صاحب)

نسل آریہ باشندے۔ تمدن اور طرز معاشرت
سرزمین ایران کی سب سے مشہور اور نادر شے اس کے باشندے
ہیں جو آریہ نسل سے ہیں۔ دندیداد میں لکھا ہے کہ ان کا اصلی وطن آذربائیجان یا شاید
شمالی ترکستان میں ایک مقام آریانا دایگو تھا۔ شدت سرمایہ دیگر وجوہ سے مجبور ہو کر
حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار برس پہلے اس قوم نے وہاں سے ہجرت کرنا شروع
کی اور رفتہ رفتہ ایران کے کل حصوں میں پھیل گئی۔

آریوں کے بعض قبیلے مشرق کی جانب روانہ ہوئے۔ اور غالباً افغانستان
میں پہنچ کر ان کے دو حصے ہو گئے۔ ایک کو ہندوکش کو پار کر کے پنجاب میں آ بسا
اور دوسرا باختر ہو چکا جہاں کیانی سلطنت کی بنیاد پڑی اور وہیں علم و تمدن کا پہلا
مرکز قائم ہوا۔

دیگر قبائل بلوچستان، مرو اور بلخ کے اطراف میں منتشر ہو گئے بعضوں
نے ایشیائے کوچک کا رخ کیا۔ اور بعض مغربی و شمالی ایران یا میدیہ (مید) میں
جا کر آباد ہوئے۔ اور آئندہ چل کر ایک سلطنت کے بانی ہوئے۔ جس کی مغربی سرحد
ملک آرم سے لگی تھی۔ اور اسی لیے آرمیا کہہ کر کے تمدن کا اُن پر بہت زیادہ اثر
پڑا۔ آریہ نسل کا ایک حصہ صوبہ فارس میں بھی جا بسا۔ جس سے آئندہ خاندان

ہخامنشی کا آغاز ہوا۔ ہجرت اور نوآبادیان قائم کرنے کا یہ تمام زمانہ جس کا اندازہ اور تاریخ معلوم کرنا ناممکن ہے اغلب یہ ہے کہ کئی صدیوں تک جاری رہا ہو گا۔

تقسیم و فرقہ بندی شروع زمانے میں سب آریہ جمہور اسے تھے۔ ان کے مختلف

قبیلے تھے۔ ہر قبیلے میں ایک کھیا یا سردار ہوتا تھا جس سے اہل خاندان وابستہ تھے۔ اور وہی اُن کی حفاظت اور باہمی نزاع وغیرہ کے تصفیہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ گورنر ش کے زمانے کی یہی طرز معاشرت تھی بلکہ آجکل بھی ایران کی تختیاری قوم اسی اصول پر کار بند ہے۔ شاہناہے میں منقول ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے ایران میں فرقہ بندی کی وہ جمشید تھا۔ اُس نے چار تقسیمین کیں یعنی تہ ویت۔ عہد سی۔ کسان۔ اور اہل حرفہ۔ مگر کتاب بندھش (اوستا) میں لکھا ہے کہ یہ اصلاح زرتشت کے زمانے میں ہوئی۔ زرتشت کے تین لڑکے تھے۔ پہلا رئیس روحانیان ہوا۔ دوسرا جہان پہلوان اور تیسرا سردار دہقان۔ زمانہ مابعد میں جب غیر آریہ اقوام یعنی تورانیوں نے نہادہ سابقہ بڑے لگاؤ مفتوحہ قوم کا ایک نیا طبقہ قائم ہوا اور اُن میں سے جنھوں نے زرتشتی مذہب کو نہیں قبول کیا انھیں دیکوسن یا دیورست کہنے لگے۔ اور انھیں حد درجہ ذلیل اور قابل نفرت سمجھتے۔ ساسانیوں نے بھی مذکورہ بالا تقسیم کو قائم رکھا اور اس کے علاوہ اپنی

عہد اس فرقے میں رتھشتاوان (رتھا + استا = ایتاودہ درویشک) بھی شامل تھے۔ یہ لقب انھیں اس لیے دیا گیا کہ ایران میں سرداران بادشاہ پر پادہ جنگ کر امار سمجھتے تھے۔ آسکانیوں اور ساسانیوں کے زمانے میں انھیں پہلوان (یعنی دارندہ یا محافظ شہر) کہنے لگے۔ یہ فرقہ ابھی جاریست۔ شجاعت۔ قابلیت۔ اور خوش اخلاقی کے لحاظ سے محبوب عام تھا۔ زمانہ صلح میں۔ ان کا مشغلہ زمینداری نیزہ بازی اور سیر و شکار تھا۔ مگر لشکر کشی یا دشمن کے حملے کے وقت یہ اپنے قبیلوں کے ساتھ فوراً میدان جنگ میں پہنچتے۔ اور شہنشاہ کے شریک حال ہوتے۔ شاہان کیانی بھی اسی فرقے سے تھے۔ لیکن لفظ کوئی (یعنی عالم روحانی) اُن کے نام کے ساتھ ملتی ہوئے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگجو ہونے کے علاوہ روحانی سرداری کا بھی دعویٰ رکھتے تھے۔

(ایران نامہ)

قوم میں ایک پانچواں طبقہ قائم کیا جسے کاتب کہتے تھے۔ اس کا کام قوانین کتبات اور احکام شاہی کو منضبط کرنا تھا۔ شاعر، جیکم اور نجومی بھی اسی طبقے میں شامل تھے یا ران میں بہ خلعت ہندوستان ذات پات کا کبھی سختی کے ساتھ لحاظ نہیں کیا گیا۔ ہر شخص پر عہد سے پرہیز سکتا تھا۔ اور ہر پیشہ ور اگر کوئی خاص قابلیت رکھتا ہو تو بادشاہ کی منظوری کے بعد اُسے دوسرے طبقے میں شامل ہونے کی اجازت مل جاتی تھی۔ یعنی مسکری یا دہقان کے لیے ہیرید ہونا ممکن تھا۔ فرزند دستور اگر چاہتا تو کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر سکتا تھا۔

طریقہ بود و باش عوام

ہاٹروں اور بلند مقاموں پر جانوروں کی کھال یا بالوں کے خیموں میں رہتے تھے۔ گرمیوں میں گرمے کے آتے ہی وہ اپنے گلوں سمیت گرم سیدلوں میں اُتاتے اور اپنا کل سا دوسا مان گھوڑوں اور اونٹوں پر لادے ہوئے جگہ جگہ پھرتے رہتے۔ بعد ازاں جس حد تک شائستگی اور مدیت آتی گئی مکانات بنائے گئے۔ بستیاں اور شہر قائم ہوئے۔ اور صنعت و حرفت کو ترقی ہوئی۔ محلات شاہی کے علاوہ جن کے آثار موجود ہیں صحیح طور پر ظہم نہیں ہے کہ عوام کس طرح رہتے سیتے تھے۔ مگر گمان غالب یہ ہے کہ زیادہ تر دیہاتی زندگی تھی اکثر لوگ زراعت پیشہ تھے۔ اہل خاندا

عہ دستر باخسویت۔ یاد مقامان۔ قدیم ایران میں شابی اور کاشکاری ترین ترین پیشے تھے۔ اگر غریب دیکھا جاتا تو دین زرتشتی کی بنیاد زراعت و آبادی پر ہی یعنی کسی غبار اور زمین کو اپنی محاکوش سبز خیز و آباد نہانا آہرین کو شکست دینا اور سب بڑا ثواب سمجھا جاتا تو دنیا و مین ایک جگہ نہ گورج۔ جب زمین کشت و جوئے سبز ہوئی تو ہر چہ چلاتا ہوا باہر آتا ہے۔ جب جو خرمین سے جدا ہوتا ہے۔ آہرین روتا ہے۔

جب جو چکی میں پستہ ہے آہرین آہ کے نعرہ بلند کرتا ہے۔ جب آہرین کرتیار ہو جاتا ہے آہرین مارے فحشہ کے بیہوش ہو جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ پیشہ زراعت نہ صرف مفاد زندگی بلکہ نجات آخری کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اور لوگوں کے مسائل میں بہت بڑے دلی انہماک اور نہ ہی جوش کا اظہار کرتے تھے ہر طرح کی زمینیں گوارا کی جاتی تھیں زمین خشک دے آہرینوں سے سرسبز و شاداب کیجاتی تھی۔ بخار دار بے ثمر اور مضر رساں پودے کھود کر بھیڑیک دیے جاتے تھے۔

سایہ نکلن اور میوہ دار درختوں کی قدر کیجاتی۔ اور موجودہ بیابان اُس زمانے میں چین و بوستان کی طرح سرسبز و لالہ زار تھے نقل ہر (اور فرو دوسا نے بھی اس کا ذکر کیا ہے) کہ زرتشت نے مقام کا شہر میں ایک سرو کا درخت

ایک ہی مکان میں رہتے سمیت تھے جس کے باہر مویشیوں کے لیے ایک علیحدہ جگہ ہوتی تھی۔ اور کتے اور قترغ بھی اس میں ضرور ہوتے تھے کیونکہ وہ مبرک سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں کی طرز معاشرت میں مذہب کا رنگ بہت زیادہ چڑھا تھا۔ اوستا کے پیشما قوانین و احکام میں روزمرہ کی زندگی تمام تر جگہ ہی ہوتی تھی، ہر مکان میں ایک آتش گاہ

لگایا تھا۔ جو الملوک عباسی کے عہد تک موجود تھا۔ جب اُس نے اسے طبع کرنے کا حکم دیا تو ہر طرف سے زرتشتی آئے اور زرد جو ہر نذر کرنے لگے مگر حاکم خلیفہ کے حکم سے مجبور تھا۔ اس نے درخت کوٹا دیا۔ اسی طرح خشتا یا رشا جب فوج کشا کی فرض سے یونان کی جانب روانہ ہوا تو اٹشے راہ میں اُسے ایک بہت بڑا سایہ دار درخت نظر آیا جسے دیکھ کر وہ اس قدر خوش ہوا کہ اسکے تپے پر سونے کا پتھر لگا دیا اور اُسکی حفاظت کے لیے اپنے ایک سردار کو وہیں چھوڑ دیا۔ (ایران نامہ)

عہ کتاب جو آجکل ایران میں اس قدر بخش سمجھا جاتا ہے کسی زمانے میں حد درجہ عزیز تھا۔ وہ چرواہے کا خاص حامی و مددگار تھا۔ بلکہ بلا اس کے ریوڑ کی زندگی محال تھی کسی شخص کی بہت نہ تھی کہ اُسے مارے یا انڈا پونچھے یا اُسے کوئی اتنی گرم خند لے کہ اُسکا بال بال اُسکی لڑائی پر ڈھکھڑھٹا ہر شخص پر لازم تھی۔ اُسکی عزت و حرمت فرض تھی۔ شہنشاہ اور امرا اُسے عین ثواب سمجھ کر کثرت پالتے تھے۔ مشہور ہے کہ تاجا منش کے زمانے میں ایک ایرانی حاکم بابل نے اس کثرت سے کتے جمع کیے کہ صرف اُن کی خوراک کے خرچ کے لیے کئی موصعون کی مالگزار می صرف ہوتی تھی۔ مذہبی کتاب میں اس جانور کی تعریف سے بھری ہوئی ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ گاہے چون شخص روحانی است و زمانے مرد جنگی دگا ہے زراع و غلام و طفل و حیوان و درندہ باشند۔ قناعت او چون شخص روحانی است۔ حفاظت گلہ چون مرد جنگی۔ و جفا کشی بچو کاشتکار و اطاعت و انکسار و تعلق مانند غلام و بازی چون کو دک و در حلقہ و دندان گرتن حیوان و درندہ می شود۔

(ایران نامہ)

عہ اس پر دانش یعنی دور بین لقب دیتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں کو ہنگام سے مطلع کرتا ہے۔ اُسے سرو شا در نیز ابینی نقیب ابزدی بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مقدس آگ و دشمن کرنے کے لیے آگاہ کرتا ہے۔ اور صبح غیزی کی مستحسن عادت کی تعریف دیتا ہے۔ مگر جو مرغ صد اسے بے ہنگام دے اُسے منحوس سمجھ کر مار ڈالتے ہیں۔

(ایران نامہ)

مزدور تھی جس کی حفاظت مالک کے سپرد تھی۔ وہ سونے سے پہلے اُسے راکھ میں دبا دیتی۔ اور صبح ہوتے ہی مالک یا بزرگ خاندان کا فرض تھا کہ خوشبودار لکڑیاں ڈال کر اُسے شعل کرنے پھر سب لوگ اس کے گرد بیٹھ کر ہر مزدور کی پرستش کرتے۔ اس کے فرشتوں سے دعائیں مانگتے خصوصاً خوشحال اور دھن دولت بخشنے والے مہرا اور آشی کے بھجن گاتے۔ اس کے بعد اپنے وزیر مرہ کے کاموں کو شروع کرتے اور کھیتی باڑی یا لکڑیاں کاٹنے میں مشغول ہو جاتے۔ جنگ کے زمانے میں بھی لوگ ملک پر فدا ہونے کے لیے کمر بستہ ہوتے۔

ہر گھر میں حسب استطاعت نوکر چاکر بھی تھے جو عموماً غیر زراعتی ہوتے تھے۔ گیلان اور ازبکستان کے باشندے چھین اور سائین بہت بُرا کہا گیا ہے عموماً غلام بنا کر رکھے جاتے۔

طرز معاشرت طبقہ اعلیٰ

جون جون تمدن بڑھتا گیا زندگی کی سادگی غائب ہوتے گئی۔ زمیندار۔ جاگیردار۔ امرا۔ مہربان (صوبہ دار) وغیرہ عیش و عشرت کے ساتھ رہنے لگے۔ شاہنشاہے میں لکھا ہے کہ کیا فی امرا کے بڑے بڑے محل تھے۔ اور وہ بڑی شان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ میدیہ کا نول اور عیش و عشرت دنیا میں مشہور تھا۔ فارس نے اُس کی اتباع کی امرا نے ہخامنش نے میدیوں ہی کے تمام عادات و اطوار سیکھے۔ بڑی عیش کے ساتھ شاندار محلوں میں رہتے تھے بکثرت غلام اور خواجہ سراؤں کی خدمت کے لیے موجود تھے۔ یونانی مؤرخوں نے میدیہ کے سرپ (روالی) کے جو حالات لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے بعد وہ بڑی شان کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ امرا بڑے خدم و حشم کے ساتھ باہر نکلتے۔ مڑکون پر پایادہ چلنا اپنی ذلت سمجھتے۔ ادنیٰ درجے کے لوگ اُن کے سامنے آتے تو بہت جھک کر آداب بجالاتے۔ اُن سے بڑے طبقے کے لوگ رخسار پر بوسہ دیتے اور ہم رتبہ بغل گیر ہوتے۔ شرفاء عموماً اپنے ہاتھ میں ایک خوشنما پھول لیے ہوئے نکلتے اور کوئی دوست آشنائے جاتا تو اُسے پیش کرتے تھے۔ داہنے ہاتھ پر کسی کو ٹھکانا باعث عزت افزائی سمجھا جاتا۔ داہنا ہاتھ دنیا قول و قرار کی نشانی تھا۔ اور غنیم کے قاصد کا ہاتھ اٹھائے ہوئے آنا صلح جوئی کی علامت تھی۔ امرا جب جنگ و جدل پہ جاتے تو بادشاہ کی طرح اپنے حرم کو بھی ساتھ لیجاتے تھے۔

طبقہ انات

اوستا میں عورت کی تعریف کی گئی ہے۔ اُسے ذلیل نہیں سمجھا گیا ہے۔ مگر عہد سامانی میں جو مذہبی کتابیں مرتب ہوئیں اُن میں اس کی برائی لکھی ہے۔ وہ ناقص العقل ہے۔ اس کی گواہی قابل اعتبار نہیں۔ اور نہ اُس میں رازداری کی صلاحیت ہے۔ یہ خلاف اس کے کیا یون کے زمانے میں عورت کی زیادہ عزت تھی اور پروردہ کا رواج عام نہ تھا۔ اس کے حقوق محفوظ تھے۔ وہ جائیداد پر قابض ہو سکتی تھی۔ گواہی دے سکتی تھی۔ شوہر کے خلاف چارہ جوئی کر سکتی تھی۔ مذہبی رسوم میں بھی شامل ہونے کی اجازت تھی حتیٰ کہ بعض موقعوں پر پردہ ہٹ کی قائم مقام بھی ہو سکتی تھی۔ روزمرہ کی زندگی میں وہ اپنے شوہر کی کھیتی باڑی میں مدد دیتی تھی۔ وہ دودھ دہتی۔ کھانا پکاتی بولیشیوں کی خبر گیری اور اولاد کی پرورش کرتی۔ اور گھر کا سارا انتظام بذات خود انجام دیتی مگر بعض اوقات اسے دور رکھا جاتا۔ مثلاً ایام حیض میں اُسے قریب آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس زمانے میں کھانا بھی اُسے دوسرے دے دیا جاتا۔ اور اس کی نگاہ ایک منحوس سمجھی جاتی۔

نیا منشی زمانے میں عورتوں کی پابندیاں بڑھ گئیں۔ غریبوں میں تو ایک حد تک آزادی تھی مگر اعلیٰ طبقہ کی خواتین بڑی سختی کے ساتھ پردے میں رکھی جاتیں۔ پردہ دار پالیوں میں باہر نکلتیں اور غیر مردوں سے ملنے جلنے نہ پاتی تھیں۔

عہد ساسانی میں گو پردہ ہٹا اب بھی ان کے خلاف تھے مگر یہ سختیاں کم ہو گئیں۔ پردہ نہ زیادہ نہ رہا۔ عورتیں مردانہ کھیلوں مثلاً چوگان وغیرہ میں حصہ لینے لگیں۔ شیریں کی مثال مشہور ہے۔ اب عورتیں صاحب جائیداد اور بزرگ خاندان بن سکتی تھیں۔ اور مرد کی عدم موجودگی میں سلطنت کی مالک بھی ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ خسرو پر وزیر کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے تخت

عہ زمانہ حیض۔ چار مہینے اور دس دن ایام حمل سے اور انہی روز بعد وضع حمل۔ ان تینوں زمانوں میں مرد عورت کے نزدیک نہ جاتا۔ اگر اس کے خلاف کرتا تو بموجب قانون مستوجب نر ا سبھا جاتا۔ (ایران نامہ)

ایران پر جلوہ گر ہوئیں۔

شادی بیاہ شادی کے لیے مذہب میں بڑا سخت حکم تھا۔ مجرد رہنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ کثرت ازدواج کی اجازت تھی۔ بیوہ کا نکاح ثانی جائز تھا۔ غیر خاندان میں شادی کرنا زیادہ قابل اعتراض نہ تھا۔ مگر دیو پرستوں سے تعلق پیدا کرنا سخت مذموم سمجھا جاتا تھا۔ عموماً ماسن بلوغ کے بعد ہوتی۔ والدین اُسے طے کرتے۔ مگر طرفین کی رضامندی بھی بعض اوقات حاصل کر لیتے۔ چٹا منشی زمانے میں کثرت ازدواج کا عام رواج تھا۔ علاوہ برہمن داشتہ عورتیں بھی بہت سی تھیں شادی باہیم بڑی دھوم دھماکا سے ادا کی جاتی تھی۔

۷۱۱ اوستان میں لکھا ہے ”بدست ترین عمل آن است کہ یک مرد زن دوشیزہ را از گرفتن شوہر مانع نشود و او را بے شوہر گذارد“۔ دریا شست پانزدہم من عورتیں اور لڑکیاں اناہیتا (ناہید) اور دایو (باد) سے اس طرح دعا مانگتی ہیں ”عظا فرایند با یک شوہر جو ان بسیار خوش شکل کہ مارا بردارند و در شہر بند و فرزندان از او پیدا کریم۔ یک شوہر فرزندان او واضح نکاح کا خطبہ حسب ذیل تھا:۔ بہر دو (شما) دادا و دوس (من کہ) میدانم۔ بیا سوزید و بداندید واسطہ دین و این (پرو مادر) یک زندگی با یک منشی با یک شما ہر دو می توانید حاصل کنید محبت یکدیگر را“ فصل ہمارا زمانہ عروسی تھا نکاح و زفاف میں کچھ مدت ہوتی تھی جب دولہن اپنے شوہر کے گھر میں آتی تو اُسے ثانی پنی یعنی خانہ بانو کہتے اور شوہر کو نانا پانی یعنی یعنی خانہ خداوند بہ خاف آریاے ہند ایران کو آریہ اپنے قریبی عزیزوں میں شادی کرنا زیادہ اچھا سمجھتے تھے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس زمانے میں ایران میں بہ نسبت ہندوستان (نچاب) کے ان کی جماعتیں زیادہ پراگندہ تھیں۔ عورتوں کی قلت تھی اور مفتوحہ یا غیر اقوام کو ذلیل سمجھ کر ان کے ساتھ ملنے جلنے سے اجتناب کرتے تھے۔ (ایران نامہ)

۷۱۲ آریاے ہند کی طرح قدیم ایران میں بھی بادشاہ کی لڑکی جب جوان ہوتی تو کل خواہشمند شہزادے ایک جاسے معینہ پر جمع ہو کر تیرا اندازی۔ شہسوار می اور نیزہ بازی کے ہنر دکھانے۔ جو سب پر سبقت لے جاتا اُسی کو شہزادی منتخب کرتی۔ آرام اور تسکین اور جن اور دوا و پدی کے واقعات ہندوستان میں مشہور ہیں۔ ایران میں بھی کتابوں نے گشتا سب کو اسی طرح منتخب کیا تھا۔

(ایران نامہ)

ارین (یونانی مورخ) لکھتا ہے کہ قدیم ایرانیوں میں شادی کے دن دولہا کو بھوکا رکھا جاتا۔ اور دولہن کے پاس جانے سے کچھ دیر پہلے جند بھل اور اونٹ کی ہڈی کا گووا کھلایا جاتا۔ جب سب مہمان دعوت اور جشن کے بعد رخصت ہو جاتے تو دولہن بن سنور کر خلوت کردہ مین داخل ہوتی اور دولہا اپنی جگہ سے اٹھ کر استقبال کو آگے بڑھتا۔ اُسے خوش آمدید کہتا اور اپنا داہنا ہاتھ بوسے کے لیے بڑھاتا تھا۔

عہد ساسانی میں بھی کثرت ازدواج کا عام رواج تھا۔ گریزبا میں اس کی زبادت تھی۔ غیر مذہب والوں میں شادی کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔ ہخامنش کی طرح بہنوں سے بھی نکاح ہو سکتا تھا۔ شادی کے وقت تمام مذہبی رسوم ادا کیے جاتے۔ عہد نامے پر لڑائی کے باپ اور لڑکے کے نمائندے کے باضابطہ دستخط ہوتے۔ اور لڑکی والوں کو لڑکے کے والدین سے حسبِ قدرت روپیہ ملتا۔ اس کے علاوہ اور بھی ہیت سے قاعدے اور قانون تھے۔ کسی عورت کا شوہر اپنا مذہب بدل دیتا تو سال بھر انتظار کرنے کے بعد وہ دوسری شادی کر سکتی تھی۔ عورت اور مرد دونوں طلاق لے سکتے تھے۔ عورت بائچ ہے تو مرد دوسری شادی کر سکتا تھا۔ اس زمانے میں عموماً پانچ قسم کی شادیاں ہوتی تھیں۔

(۱) بادشاہ زن۔ وہ عورت جسے اُس کے والدین نے شادی میں دیا ہو۔

(۲) اوک زن۔ وہ لڑکی جو اپنے والدین کی اکلوتی ہے۔ جب اُس کا بیاہ ہو تا تو اُس کے والدین دولہا سے یہ وعدہ لے لیتے کہ اُس کے پہلے بچے کو اُنھیں اپنے پاس رکھنے کا حق ہو گا۔

(۳) ستر زن۔ پندرہ برس سے زیادہ عمر کا مرد بن بیاہا جاتا تو اُسے عزیز ایک لڑکی کو جینر دے کر کسی شخص سے بیاہ دیتے جس کے عوین میں وہ عورت مر نیکی بعد دوسری دنیا میں متوفی شخص کی بیوی سمجھی جاتی! اور زائے حیات میں اُسکی جس قدر اولاد ہوتی اس میں سے نصف متوفی شخص کی اور نصف اپنے دنیوی شوہر کی قرار دی جاتی۔

(بقیہ صفحہ ۱۲۸)

انگلستان کی عورتیں

(جملہ حقوق محفوظ)

(از مولانا شرمہ رحمہ و مغفور)

اخباروں کی دنیا میں عورتوں کے آجانے سے بہت سے وہ خاص سبکٹ چھو گئے ہیں جن کو صرف عورتوں سے تعلق ہے۔ جن میں سب سے زیادہ اہم چیز فیشن اور لباس کی قطع و برید ہے اس قسم کی باتوں میں کسی جگہ کے مردوں کو لطف نہیں آتا۔ مگر انگلستان اور دیگر ممالک میں عورتیں ترقی کر کے اس درجہ پہنچ گئی ہیں کہ قطع نظر ان اخباروں اور رسالوں کے جو خود عورتوں کے ہاتھ میں ہیں وہ رسالہ اور اخبار بھی جن کی ایڈیٹری کی کرسی پر مرد بیٹھے ہو تو ہیں اسی امر پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنے پرچوں کے اشاعت میں ضرر پہنچ جانے کے خوف سے دو ایک صفحہ فیشن اور ان سبکٹوں کے نذر کر دیں جن کو خاص عورتوں کے مذاق سے تعلق ہے آپ کے بیان عورتوں کا لباس بُرا ہو یا بھلا جیسا ہو ایک حالت پر ٹھہرا ہوا ہے بشکل اس میں کسی قسم کی اصلاح کی بھی جائے تو اس کا اثر دو ہی میں مگر دن تک محدود رہتا ہے۔ بخلاف اس کے وہاں ان اخباروں کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ مغز معزز لیڈیان شہر کی سیر کرنے اور باغوں کی ہوا اٹھاتی ہیں۔ عورتوں کا لباس وہ درجہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ لندن کی ہر سڑک اور ہر باغ کو لباس کی تراش و تراش اور بانگین کی حیثیت سے ایک نمائش کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ جہاں ان چیزوں کا مقابلہ اور اس کے ساتھ ایک دوسرے سے اخذ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

علی ترقی سے وہاں کی عورتوں کے حوصلہ ایسے بڑھ گئے ہیں کہ وہ اب ان تمام کرسیوں تک پہنچنا چاہتی ہیں جو اس وقت تک صرف مردوں ہی کے لیے مخصوص ہیں۔ وہ پارلیمنٹ کی ممبر بننا چاہتی ہیں۔ وہ یونیورسٹیوں اور دارالعلوم کے انتظام میں شرکت کی دعوے دار ہیں۔ اور قریب زاتہ آگیا ہے کہ وہ کسی بڑے پادری اور بپ کی خدمت کی بھی آئندہ مند ہو جائیں اور چونکہ اس وقت تک ان تمام مقامات سے مردوں کو ڈھکیل رہی ہیں۔ لہذا یہ خیال عام طور پر عورتوں میں پھیلتا جاتا ہے کہ مردان کو ترقی سے روکتے ہیں۔ اگرچہ اگلے قوانین میں بہت کچھ ترمیم ہو گئی اور وہ فرق بھی مٹ گیا جس کی وجہ سے مسلمان سبقت کو الزام دیتے تھے کہ ان کے وہاں باوجود اس آزادی

کے عورت کے حقوق مرد سے کم رکھے گئے ہیں یعنی شادی کے بعد عورت اپنی جائیداد پر بھی قابض نہیں رہتی تھی۔ اور قانوناً شوہر کا قبضہ ہو جاتا تھا۔ اب عورتیں اپنی جائیدادوں کی مالک ہیں جو اپنے نام سے رہن نامہ اور بیعنامہ کر سکتی ہیں مگر اس پر بھی عورتوں کو اطمینان نہیں ہوا۔ اور آج بھی ان کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہے کہ انگلستان کا قانون مردوں کی طرف داری کرتا ہے۔ اور وہ یہ کہ گرجے کے قانون کے مطابق شادی کو بعد ایک حد تک عورت کو مرد کا تابع فرمان ہونا پڑتا ہے۔ طلاق کے مقدمات میں اگر مرد کی طرف سے درخواست ہو تو صرف عورت کا زنا ثابت کر دینے پر طلاق مل جاتی ہے۔ اور سب سے زیادہ نمایاں فرق یہ ہے کہ اگر عورت کی درخواست ہو تو ضرور ہے کہ مرد کے زنا کے ساتھ یہ بھی ثابت کرے کہ اس نے اس عورت پر ظلم بھی کیا۔ اور حقیقت میں یہ قانون کچھ فضول سا معلوم ہوتا ہے قطع نظر عورتوں کو دو باتوں کا بار ثبوت ڈالنے کے یہ بڑی لغویت ہے کہ اگر کسی شریف مرد یا عورت کو کسی اندرونی جھگڑے یا مصلحت سے طلاق کی ضرورت لاحق ہو جائے تو قانون کا دروازہ ان پر بند ہے اور وہ مجبور ہیں کہ اپنی کسی جائز غرض حاصل کر کے لیے زنا کے بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہوں۔ یہ قانون انصاف یہ ہے کہ ایک حد تک زنا کاری کی جرأت دلاتا ہے۔ الغرض یہی باتیں ہیں جنکی وجہ سے عورتیں موجودہ قانون سے روز بروز زیادہ ناراض ہوتی جاتی ہیں۔

شاید گزشتہ سال ہی کا واقعہ ہے کہ ایک شریف لڑکی نے جو نہایت تعلیم یافتہ اور عورتوں کی ایک معزز سوسائٹی کی سکریٹری بھی تھی۔ انھیں مندرجہ بالا وجوہ پر نکاح کرنے سے قطعاً انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ جب تک جوہ قانون میں ترمیم نہ ہوگی میں شادی نہ کروں گی۔ ان باپ نے مجبور کرنا چاہا اور جان کی کسی طرح نہ چلی تو اُنھوں نے ایک ڈاکٹر کی مدد سے لڑکی کو مخمور بنا کے پاگل خانہ میں پہنچا دیا۔ لیکن جب اس سوسائٹی کو یہ خبر پہنچی تو دوسری ممبر عورتوں نے مقدمہ عدالت تک پہنچا دیا۔ وہ لڑکی ایک قومی مجاہد کی شان سے پاگل خانہ سے باہر نکلی اور مقدمہ نے بہت طول کھینچا اگرچہ ان باپ نیک نیتی کے بنا پر بری کر دیے گئے۔ مگر ڈاکٹر بہت الزام آیا۔

اسی ایک لڑکی پر موقوف نہیں آزادانہ تعلیم نے وہ ان ایسی ہی صدا
اور ہزار لڑکیاں پیدا کر دی ہیں۔ جو نہایت ہی استقلال اور جرأت کے ساتھ اپنے
حقوق کے لیے لڑ رہی ہیں جن کی مذکورہ بالا اوالعزمیوں کو شاید آپ اپنے خیال
میں نہ پسند کرتے ہوں گے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ انھیں کے مبارک ہاتھوں سے بعض
ایسے اہم کام اجرا پا گئے ہیں جن کی اوپر آپ کا کائنات بھی داد دینے لگے گا۔
انھیں کی سرگرمی سے وہ ان ایک ایسی سوسائٹی قائم ہو گئی ہے جو ان مان پاپ
سے سخت باز پرس کرتی ہے جو اپنے بچوں پر ظلم کریں۔ ایسی سوسائٹی کی شاید آپ
کے بیان ضرورت نہ ہوگی۔ گردان اس کی سخت ضرورت ہے اس لیے کہ اس نرزمین
میں لوگوں کی اور خاصہ غریبوں کی اولاد بہت کثرت سے ہوتی ہے نو دس بچہ اولاد
کی اوسط تعداد ہے۔ اور چونکہ ذریعہ معاش تنگ اور زندگی بسر کرنا بہت گران
ہو گیا ہے اس لیے اکثر ان باپ اپنے بچوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے واقعات وہاں
روز پیش آتے رہتے ہیں۔ اولاد کی طرف سے وہاں بے پردا ہونے کے چند اور وجوہ
بھی ہیں جن کا حال آپ کو آگے چل کر میرے بیان سے معلوم ہوگا۔ بہر تقدیر یہ سوسائٹی
اپنے جاسوسوں اور خبر سانوں کے ذریعہ سے ایسے واقعات کا پتہ لگاتی رہتی ہے۔
اور جہاں کوئی واقعہ ہلکا ہلکا فوراً مقدمہ عدالت میں بھیجا جاتا ہے۔ اور
سوسائٹی کی طرف سے وکیل یا برسر طر حاضر عدالت ہو کے پیروی کرتا ہے۔ تمام تعلیم یافتہ
اور لائق عورتوں کو اس سوسائٹی سے پوری ہمدردی ہے۔ اور اپنے پاس پتہ دس
میں جہاں کسی کو اپنے بچوں پر جو رو تشدد کرتے دیکھتی ہیں فوراً سوسائٹی کے سرکاری
کو لکھ بھیجتی ہیں اور ساتھ ہی تحقیقات شروع ہو جاتی ہے۔

انھیں بچوں اور خاصہ لڑکیوں کے لیے اور بھی بہت سے ایسے انتظام
کر دیے گئے ہیں کہ ملک کی عورتیں روز افزون ترقی کرتی جاتی ہیں۔ ڈنڈر کیسل کا
نام آپ میں سے اکثر حضرات نے سنا ہوگا۔ جہاں ملکہ معظمہ اکثر اوقات تشریف رکھا
کرتی ہیں حالیشان قصابی متوسط درجہ کے قصبہ میں واقع ہے جس کی آبادی ۲۵
ہزار کے قریب ہے اور یہ قصبہ ڈنڈرز کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ایک سوسائٹی
خاص لڑکیوں کی خبر گیری کے لیے قائم ہے۔ جن کے مان باپ غریب ہیں۔ اور اولاد

کی خبر گیری نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی لڑکیوں کو یہ سوسائٹی اپنی زیر نگرانی ایک مکان میں رکھتی ہے۔ سن بلوغ اور خود اپنی خبر گیری کر سکنے کی عمر تک تعلیم دلاتی ہے کھا باکٹر ادیتی ہے۔ ضروریات زمانہ کی تعلیم دلاتی ہے۔ اور جب وہاں سے اگلنے کے قابل ہو جائیں تو ایسے کاموں سے لگا دینے کی کوشش کرتی ہے۔ جن سے وہ بسر اوقات کر سکیں۔ گذشتہ ماہ اس سوسائٹی کے سالانہ جلسہ میں وہ خادمہ بھی گئی تھی جو خود میرا کام کرتی تھی۔ اس کی تین بہنیں اس سوسائٹی کے زیر حمایت پرورش پا رہی تھیں اور اسی کی نہ بانی مجھے معلوم ہوا کہ بارہ سولہ لڑکیوں کے قریب اس وقت اس سوسائٹی کے زیر نگرانی تھیں۔ یہ کام بھی انھیں لائق اور تربیت یافتہ خاتونان انگلینڈ کا ہے۔ جن کی برائی یا بھلائی ہنوز آپ کے بیان زیر بحث ہے۔

اس موقع پر مجھے یہ بھی بیان کر دینا چاہیے کہ وہاں لڑکے ہوں یا لڑکیاں دونوں کی تعلیم زیادہ تر کوشش اس بات کی کیجاتی ہے کہ وہ بورڈنگ ہوس میں پھیلے جائیں بات یہ ہے کہ آپ کے بیان بچوں کی پرورش و تعلیم میں ان باپ ایک حد تک یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ بچے بڑھاپے میں ہماری خدمت کریں گے اور اس وقت جبکہ ہمارے دست و پا کام دینے سے رہ جائیں گے ہمارے کام آئیں گے۔ وہاں برخلاف اس کے ماں باپ کا خیال کبھی اس طرف جاتا ہی نہیں۔ وہ صرف مجبوری کے ساتھ نیچر یا قانون قدرت کا حق ادا کرتے ہیں اور جب تک بچے سن بلوغ یا تینز کو پہنچیں ان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ عورت اور مرد دونوں کو جو کہ اپنے نفسانی اور ذاتی حظوظ کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ لہذا بچوں کی پرورش میں بھی اسی حد تک تن دہی کیجاتی جہاں تک کہ اپنی آسائش میں خلل نہ پڑے بچوں کی پرورش میں جو کہ کوئی ذاتی غرض اور امید نہیں ہوتی لہذا ماں باپ کو اور اعلیٰ الخصوص ماؤں کو ان کے ساتھ ویسی بے صبری کی محبت بھی نہیں ہوتی جیسی کہ ہندوستان کی ماؤں کو اپنے کلچر کے ٹکڑے کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اکثر ماں باپ جن کی آمدنی کم ہے۔ یا جو بعسرت بسر اوقات کرتے ہیں۔ اولاد کی طرف سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بعض سیدہ دل تو اس فکر میں ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح قانون کی حد سے یکے معصوم بچوں سے اپنا چچا چچا لیں۔ وہ ان میان بی بی دونوں کا یہ جی چاہتا ہے کہ گھر میں ہر وقت اکیلے

رہیں۔ میان ہر گھر می بی بی کے آغوش محبت میں اور بی بی عاشق میان کے گلے کا ہار
رہیں۔ جو عشق لیلیٰ کو مجنون کے ساتھ ہو گا وہ انگلستان میں قریب قریب ہر مرد کو اپنی
بیوی کے ساتھ اور بیوی کو اپنے میان کے ساتھ ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایسا
عشق ہوا اور جہاں ہر وقت ایک دوسرے کے حُسن اور صحبت کے مزے اُڑانے کی فکر
ہو۔ وہاں غریب بچے کس قدر کانٹے کی طرح کھٹکتے ہوں گے۔

بورڈنگ ہوس جو وہاں خوب آباد ہیں اور لڑکوں اور لڑکیوں سے خوب
بھرے ہوئے ہیں۔ اسکی وجہ ہمارے بیان اکثر لوگ انگریزوں کی علم بندی سمجھ
ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہتا کہ ایسا نہیں ہے۔ مگر زیادہ تر اس کی تائید اور تعمیل صرف
اس خیال سے ہوتی ہے کہ ماؤن کو ان بورڈنگ ہوسوں سے اپنے عیش میں
خلل ڈالنے والے بچوں سے پیچھا چھڑاؤ کا عمدہ اور نہایت شائستہ موقع مل گیا ہے۔
تمام متوسط درجہ کے لوگ جو سالانہ سو ڈیڑھ سو پونڈ خرچ کر سکتے ہیں۔ اپنے بچوں
کو ان بورڈنگ ہاؤسوں میں بھیج دیتے ہیں جو سو اچھی کے اوقات کے ہمیشہ گھر اور ماں
باپ سے جدا ایک دوسری دنیا میں رہا کرتے ہیں۔

اس موقع پر مجھے یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ عورتوں میں کس قسم کی درزشوں
کا زیادہ رواج ہے۔ اصل میں لڑکیوں کے لیے وہاں صرف ٹھکانا اور تین چار میل
چل لینا کافی سمجھا جاتا تھا یا ٹینس کھیل لینا کرتی تھیں۔ اور بعض ایسے رازدبان گھوڑے
کی سواری کرتی تھیں۔ مگر اب عورتیں روز بروز ذرا ثابت کر لی جاتی ہیں کہ تہذیب کی درزش
اُن کے لیے مفید اور ضروری ہے۔ وہ کرکٹ اور فٹ بال کھیلتی ہیں کشتان چلاتی
ہیں۔ لڑکوں کی طرح ڈرل اور قواعد کرتی ہیں۔ نشاۃ اندازی کی مشق کرتی ہیں
شکار کو جاتی ہیں۔ اور اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ باکسنگ یعنی لٹھی اور
فینسنگ یعنی تیغ زنی میں بھی مہارت حاصل کرنے لگی ہیں۔ اُن کو دعویٰ ہے کہ تیار
دار نرس ہی نہیں بلکہ ایک سربف سپاہی کی حیثیت سے بھی وہ میدان جنگ میں جاسکتی
ہیں۔ ان درزشوں کا یہ اثر صاف ظاہر ہو گیا کہ عورتیں بمقابلہ سابق کے قدرِ قامت
میں بہت بڑھتی جاتی ہیں۔ اور ایک گھڑی بھر کے لیے بھی آپ لڈن کی کسی ٹرک پر کھڑے
ہو جائیں تو آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ وہاں کی عورتیں قدرِ قامت اور توانائی

مین ساری دنیا کی عورتوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔ مین نے وہیں ایک اخبار میں پڑھا تھا۔ کہ گذشتہ ۳۰ سال کے عرصہ میں عورتوں کے قد کی اوسط دراندی چار یا پانچ انچ بڑھ گئی ہے۔ بہت سی عورتیں ایسی نظر آتی ہیں جو بیان کے بڑے سے بڑے مردوں سے بھی زیادہ بلند بالا اور قوی مہکل ہیں۔

پور ڈونگ ماؤس کے بعد جب اوسط درجہ کی تعلیم ہولیتی ہے تب ماں باپ لڑکوں کو اور اکثر لڑکیوں کو خود انٹین کے مذاق کے مطابق بہ حیثیت ایک اپرنٹیس یعنی کار آموز کے کسی کارخانہ میں یا کسی مشہور پیشہ والے کے پاس بھیجتے ہیں۔ وہاں بھی پور ڈونگ ماؤس ہوسون کی طرح سالانہ ایک رقم ادا کیجاتی ہے جس کی تعداد سو پونڈ سے کم نہیں ہوتی۔ اور لڑکوں کا کھانا اور ان کے ضروریات کا انتظام اسی رقم سے کیا جاتا ہے۔ الغرض ایک معمولی تعلیم کے بعد کسی پیشہ سے لگا دینا اور کمانے کے قابل بنادینا ماں باپ کا فرض سمجھا جاتا ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کرنا وہاں ماں باپ کا فرض نہیں ہے یہ خود ان کا ذاتی کام ہے۔ لڑکے جب کچھ روپیہ کمانے لگتے ہیں تو وہ براہ اپنے ذاتی مصارف سے کچھ رقم بچا کر شروع کرتے ہیں اور جب وہ رقم اُس مقدار اور تعداد کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ ایک نیا گھر قائم کر سکیں تب شادی کا ارادہ کرتے ہیں اور لڑکیوں کی طرف اسی غرض سے متوجہ ہوتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو اپنی زوجیت کے لیے چھ ماہ میں یہ تو لڑکوں کا حال تھا۔ مگر لڑکیاں تعلیم پانے کے بعد ہی اگر کسی جگہ نوکری ہو گئیں یا کسی کام سے لگ گئیں تب تو نہایت اطمینان اور فارغ البالی کے ساتھ اس امر کا اندازہ شروع کرتی ہیں۔ کہ کس سے شادی کریں اور کون ایسا شخص ہے جو ان کے ساتھ زندگی بھر اچھی طرح نباہ کرے گا۔ اس انتخاب میں ان کو جلدی اور غلبت نہیں ہوتی۔ سالہا سال گزر جاتے ہیں اور وہ اسی طرح کنواری بیٹھی رہتی ہیں۔ عورتوں کے اس طبقہ میں جو نوکری پر بسر کرتا ہے یا جو اپنی معاش کا ذریعہ آپ پیدا کر لیتا ہے۔ مین نے ہزار ہا ایسی عورتیں دیکھیں جن کی جوانی ختم ہو گئی اور چالیس پچاس برس کی عمر کو پہنچ گئیں۔ مگر اسی طرح کنواری بیٹھی ہیں۔ اور آج تک مہلک نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ اور آپ

کی بدگمانی کے خلاف میں نے ان میں بہت کم عورتوں کو خراب اور بے عصمت پایا۔ یہ بھی نہیں جیسا کہ بیان مشہور ہے کہ ان کو شوہر نہیں ملتے۔ نہیں ملتے ہیں اور کثرت سے ملتے ہیں مگر ایسے جن سے ان کو بناہ کا اطمینان نہیں ہوتا۔ اور ان کے ساتھ شادی کرنے کے مقابلہ میں وہ زندگی بھر کنواری بیٹھا رہنا پسند کرتی ہیں۔ یہ تو ان لڑکیوں کا حال تھا جو اپنے ذریعہ معاش کو پیدا کر لیتی ہیں۔ رہیں وہ لڑکیاں جو خود کمانے کے قابل نہیں ہیں۔ ان میں درحقیقت نکاح کے متعلق زیادہ بے صبری ہے۔ وہ درس گاہوں کے چھوڑنے ہی شوہر کی تلاش میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ اور اس میں ماں باپ سے بھی ان کو کافی مدد ملتی جو ان میں معشوقیت کی شان پیدا کرنے کے لیے والدین کو کپڑوں اور آراستگی کے سامانوں کا زیادہ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ شوہر کی جستجو پہلے اسی محلہ اور قرب و جوار بلکہ عزیزوں سے شروع ہوتی ہے اور جب اس حلقہ میں کامیابی نہیں ہوتی تو محسوس کا دائرہ اور وسیع کر دیا جاتا ہے۔ اکثر دات میں رہنے والے ان باپ اپنی لڑکیوں کو لندن میں بھیجتے ہیں جو وہاں کے اصطلاح میں انتخاب شوہر کا سب سے بڑا میدان ہے۔ اور وہاں کی سوسائٹی میں شریک ہونے اور باہمی دعو توں میں آنے جاتے اور نو جوانوں کے ساتھ ناچنے سے بہت جلد اچھے شوہر مل جاتے ہیں یہی نہیں ہمارے موسم میں جبکہ طرح طرح کی دلچسپی کی صحبتیں جاری ہو جاتی ہیں۔ اکثر جاہلین لطف و زیادہ دیکھنے کے لیے یٹس میں کشیوں پر سر کر کے لطف زندگی اٹھاتی ہیں۔ اور برائین یاسینٹ لیا رڈ کے ایسے ساحلی مقاموں میں جا کے سیر و تفریح میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ اس وقت خوش حال بلکہ متوسط الحال ماں باپ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اپنی لڑکیوں کو بھی ان مقامات میں بھیجیں تاکہ ان کو ایک اچھے شوہر کے دستیاب کرنے کا عمدہ موقع ملے۔ اور میں کہتا ہوں کہ انھیں لڑکیوں کی عصمت خطرے میں ہوتی ہے اگرچہ ان میں اپنے بچانے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرنے کی بخوبی لیاقت ہوتی ہے۔ لیکن کہیں ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ بعض بد معاش دشمنان نوع انسانی ان کو دولت و عشرت کا سرباز دھاکے بے عزت و بے آبرو کر ڈالتے ہیں۔ اور جان کوئی لڑکی اس طرح خراب ہوئی۔ اور اس کی خرابی چار پانچ کے کان تک پہنچ گئی پھر وہ ایسی خراب ہوتی ہے کہ نہ دین کی رہتی ہے اور نہ دنیا کی۔ میرے خیال میں لڑکیوں کو جیسی سخت سزا نہ ملے وہاں پہنچتی

ہے ویسی دنیا کے کسی حصہ میں شاید نہ ملتی ہوگی پھر یہ نہ شرفا کی سوسائٹی میں شریک ہو سکتی ہے۔ نہ کوئی ملتا ہے۔ اور نہ کوئی اس سے نکاح کرتا ہے۔ ان باپ نے اگر تمہیں کھا کے گھر میں رہنے دیا تو چند روز خاموش پڑی رہتی ہیں در نہ سوا اس کے کہ فاحشہ عورتوں میں مل کے اپنی معاش کو سڑکوں پر ڈھونڈھتی پھرین اور کسی طرح اپنا پیٹ نہیں پال سکتی ہیں میرے خیال میں انگلستان میں جس قدر افسوسناک حالت ان عورتوں کی ہے۔ اور کسی کی نہیں۔ ان کو نہ کرای بھی نہیں ملتی۔ اور سوا بدکاری کے اور کوئی پیشہ اختیار نہیں کر سکتی ہیں۔ اسی امر پر اکثر ناول نویسوں نے زور دیا ہے۔ اور ان غریب عورتوں کی طرف پبلک کو نہایت سوز و گداز کے الفاظ میں متوجہ کیا ہے۔ اور چونکہ مردوں کو زنا کی کوئی سزا سوسائٹی سے نہیں ملتی۔ لہذا تعلیم یافتہ عورتیں اس کو قانون سوسائٹی کا بہت بڑا ظلم خیال کرتی ہیں۔ اور صاف کہتی ہیں کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں پر بڑا ظلم ہوتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان عورتوں کی حالت بیان کی بیوہ عورتوں سے بھی زیادہ خراب اور ذلیل ہو رہی ہے۔

الغرض مندرجہ بالا طریقوں سے وہاں جب لڑکیاں اپنے لیے شوہر منتخب کر پاتی ہیں تو نکاح ہو جاتا ہے۔ نسبت ٹھہرانے کا یہ طریقہ آپ کے خیال میں کتنا ہی شرمناک اور مخدوش ہو۔ مگر انگلستان اس سے بہت بڑا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اور میرے خیال میں انگریزوں کی ترقی کا پہلا ہی ذریعہ ہے۔ ان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو آپس میں شادی کا اقرار کر لیتے ہیں۔ اور چونکہ جب تک نیا گھر آباد کرنے کے قابل روپیہ نہ فراہم کر لین شادی نہیں کر سکتے۔ اقرار کے بعد بھی دونوں روپیہ فراہم کرنے کی طرف نہایت گنجوشی سے متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس قدر متوجہ ہو جاتے ہیں کہ ان کو دنیا کی کسی لذت میں بہت کم مزہ ملتا ہے جس مکان میں رہتا تھا اس کے پڑوس ہی میں ایک نو عمر لڑکا تھا۔ جس کی عمر بیس برس کی ہو گئی۔ اس سے اور ایک لڑکی سے نکاح کا اقرار ہو گیا تھا۔ یہ لڑکی ڈیڈ زرمین جو وہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا رہتی تھی۔ اور ہر اتوار کو یا زیادہ اپنے آئندہ شوہر سے ملنے کے لئے آتی تھی۔ یہ لڑکا حارس میرا بہت بڑا دوست تھا۔



(از خباب لطافت حسین صاحب)

بقیہ صفحہ ۱۳۶

(۴) جا کر زن جس بیوہ کے کوئی اولاد نہ ہوا اور وہ دوبارہ شادی کرے تو اسے اس نام سے پکارتے۔ دوسرے شوہر سے جتنے بچے ہوتے ان میں سے نصف پہلے شوہر کے سمجھے جاتے اور جب وہ مرجاتی تو تمام رسوم میں اسے پہلے ہی شوہر کی بیوی کہا جاتا۔

(۵) خود سرنزن۔ وہ عورت جو اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرے۔

عہ پر وفیسر حسین زائے حال کے پارسوں کی رسم شادی کے متعلق لکھتے ہیں کہ ہندوستان اور ایران دونوں میں شادی کی عمر ۲۵ سے ۳۰ برس تک مرد کے لیے اور ۱۴ سے ۱۹ سال تک عورت کے لیے موزون سمجھی جاتی ہے بعض اوقات چھوٹی عمر میں بھی خصوصاً ایران میں بیاہ دیتے ہیں والدین کی رضامندی کے علاوہ بڑے پردہت کی اجازت بھی ضروری ہے ہندوستان میں قاعدہ ہے کہ نکاح کے وقت دولہا اور دولہن دونوں سامنے بیٹھتے ہیں اور جانبین کے گواہوں کے اقرار کے بعد دوبرہت سامنے کھڑے ہو کر کچھ دعائیں پڑھتے ہیں جن کا کچھ حصہ ہندوؤں سے لیا گیا ہے اور سنسکرت زبان میں ہوتا ہے۔ ایران میں دولہن دولہا کے سامنے نہیں آتی۔ نکاح کے وقت عزیز و اقارب سب جمع ہوتے ہیں پھر ایک پردہت آتا ہے اس کے داہنے جانب دولہا بیٹھا ہوا اور دولہن کے نمائندے ہوتے ہیں اور بائیں جانب دولہا کا باپ اور دیگر عزیز ہوتے ہیں۔ دولہن کا نمائندہ دولہا کو شکر کی ایک دلی دیتا ہے جسے وہ قبول کر کے کھالیتا ہے پھر دیگر رسوم کے بعد پردہت نکاح کا خطبہ پڑھتا ہے جسے انداز گواہ کہتے ہیں۔ بعد ازاں طرفین کے لوگ ایک دوسرے کو شکر بانٹتے ہیں اور رات کا کھانا کھا کر سب مہمان دولہن کو لیے ہوئے جوہر سے بڑا شکر لٹکی لباس میں چھپی ہوتی ہے دولہا کو ہونچ کر رسم دیا کر دی ہیں۔

اولاد

ایرانی کثرت اولاد کو نہایت درجہ موجب برکت سمجھتے تھے اور لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ یہ خیال آج تک موجود ہے۔ فتح علی شاہ قاجار کے تین ہزار سے زیادہ بال بچے تھے۔ قدیم زمانے میں جس کی اولاد زیادہ ہوتی اُسے بادشاہ ہر سال انعام و اکرام عطا کیا کرتا۔ جس کی اولاد نہ ہوتی اُسے بڑا بد نصیب تصور کیا جاتا۔ وہ کسی لڑکے کو لے کر متبنی کرنا ورنہ اُسکی روح کو چنود کے پل پر سے گزرنے کی اجازت نہ ملتی۔ اگر اتفاق سے وہ اس فرض کو ادا کیے بغیر مر جاتا تو اُس کا پر و ہمت اور عزیز اقارب کسی لڑکے کو اُس کے نام سے متبنی کر لیتے اور اس طرح اُسے دوزخ کی آگ سے نجات دلاتے۔ بچوں کے لیے والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری بہت بڑا فرض کی گئی تھی۔ ان کی شادی بیاہ کا اُنھیں پورا اختیار تھا۔ اور اُن کی مرضی کے بغیر بچے کوئی کام نہ کرتے تھے۔

تعلیم و تربیت

دو تین سال تک ماں خود اپنے بچے کو دودھ پلاتی اور عموماً ایک سال کی عمر تک وہ گھر میں رہتا اسکے بعد ایک مرد اناجی کے سپرد کر دیا جاتا۔ اوستا نین مذہبی تعلیم کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ مگر تنہا منشی سپاہی اور جنگجو تھے۔ ان کے زمانے میں امرا کے لڑکوں کو زیادہ تر جنگی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور طرح طرح کی

عہ اس زمانے کی ثروت کا انحصار کثرت اولاد و مویشیوں پر تھا وندیداد میں لکھا ہے: آتش دہا سیکند کہ گدہ گاو و فرزند ان براس تو زیاد بشوند و دوسری جگہ موبد مقدس آتش سے خطاب کر کے اس طرح دعا مانگتا ہے۔ عطا فرما فرزند انیکہ جاے سکونت بیا بند و نزدیک من باشد و مرا تنگم خطرتا نمایند قهرمانان بشوند و امور معیشت و کارخانہ مارا اصلاح و ترقی بدہند (ایران نامہ) عہ افلاطون کہتا ہے کہ سات برس تک شہزادے کی تربیت خواجہ مراکزاہ سواری اور شکار کرنا سکھانا۔ چودہ برس کے بعد شہزادہ اُسکی کفالت سے نکل کے چار موبدوں کے سپرد ہوتا جو اُسے فلسفہ اور احکام شریعت کی تعلیم دیتے۔ قوانین حکمرانی سے آگاہ کرتے اور سب سے زیادہ جن اخلاق و راست گوئی کی تلقین کرتے اور یہ عہد و پیمان لیتے کہ جب تک زندہ رہے صداقت و راستی کو ترک نہ کرے۔

ز نون لکھتا ہے کہ شہزادوں کا مکتب شاہی محل کے سامنے تھا۔ اس عمارت کی چار جھڑے تھیں۔ اول میں پانچ سے سولہ برس تک کی عمر کے لڑکے تھے۔ ان کی تعلیم بجائے لکھنے پڑھنے

وزر شون اور قواعد سے جہانی تکالیف کا عادی بنا دیا جاتا تھا۔ بابہ تختہ میں محل شاہی کے قریب اور دوسرے شہروں میں مزر بان کے محل یا کسی دوسری عمارت میں ان کو رکھا جاتا۔ لڑکے بازاروں کے قریب ہرگز نہ جانے پاتے تاکہ دروغ گوئی اور دھوکہ دینے کی عادات نہ پڑ جائے۔ صبح سویرے ایک گھنٹہ بجتا۔ فوراً سب لڑکے اپنے بستروں پر سے اٹھ بیٹھتے اور ان کی پچاس پچاس کی جماعتیں کسی شہزاد یا وزیر زادے کی ماتحتی میں ایک جگہ جمع ہو جاتیں۔ قواعد شروع ہوتی۔ دوڑ دھوپ کرتے۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر سرپٹ دوڑاتے ہوئے اترنے اور چڑھنے کی مشق کرتے۔ نیزہ بازی۔ شمشیر زنی۔ تیر اندازی۔ اور شادری وغیرہ میں مشغول رہتے۔ وہ جانور بھی چراتے اور کھلے میدانوں میں رات بھر جاگتے بسر کرتے۔ سخت دھوپ میں گھنٹوں دوڑاتے جاتے اور برت اور کمرے میں دریاؤں کو بھرتے۔ ان کی غذا رڈی نمک اور اُبلایا ہوا گوشت تھا۔ جب میس برس کے ہو جاتے تو فوج میں کوئی ادنیٰ افسری دیجاتی یا بعض کو ملکی عہدے بھی مل جاتے۔ اس فرض کے لیے سیاسی تعلیم بھی نصاب میں داخل تھی۔ ان کو قانون بھی سکھایا جاتا اور پرانے کارناموں اور الوالوں کی داستانیں سن کر ان کی ہمتیں بلند کی جاتیں۔

(بقیہ صفحہ ۴۶) کے اخلاق ستودہ۔ راست گوئی۔ اطاعت بزرگان اور قناعت و سادگی کی تھی۔ شہسواروں تیر اندازی اور زور و بدن انگینی میں بھی اُنھیں ماہر بنایا جاتا۔ دوسرے حصے میں دس سال تک رہتے اب بادشاہ کے ہر کام پر شہسوار بھی جاسکتے۔ اور اسی زمانے میں شبانی۔ باغبانی۔ بخاری۔ ہنر و لک داری اور عدالت وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے۔ تیسرے حصے میں فنون جنگ کی تکمیل ہوتی اور میدان جنگ میں جا کر شجاعت و بہادری کے جوہر دکھاتے۔ چوتھے درجے میں قوانین شرع۔ آئین و دوا و فلسفہ اور دیگر علوم و فنون کی تکمیل کیجاتی۔

ظاہر ہے کہ یہ تعلیم ہر شخص کے لیے نہ تھی۔ بلکہ مختلف طبقہ کے لوگ اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت دیتے تھے۔ فردوسی شہزادوں کی تعلیم کے متعلق شاہنامہ میں اس طرح لکھتا ہے: تہن ہر دیش بزرگستان۔ نوشتن گو ساخت در گستان۔ سوار ی تویر کمان و کماند۔ غنائ کریں چہ چون چند نوشتند کہ وچان۔ بیسار۔ ہان بازو شاہین یاز و شکا۔ زبید و داد و ز تخت و کلا۔ سخن گفتن و ز م رازن سپاہ

بے رنج برداشت کا مدبر

ہنر ایام و خنثی سر بسر

(ایران نامہ)

پر مہنوں کے لڑکے عموماً مذہب حکمت اور قانون کی تعلیم حاصل کرتے۔ انہیں لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا۔ مگر کتابیں بہت کم تھیں۔ زیادہ تر حافظہ پر دار و مدار تھا۔ قدیم زمانے میں کوئی خاص عمارت تعلیم گاہ کے لیے مخصوص نہ تھی۔ یہ وہبت کا گھر یا آتش کدہ کے طبع کوئی کمرہ کافی سمجھا جاتا تھا۔ مگر ساسانیوں کے زمانے میں خصوصاً عہد نوشیروان میں بہت سی تربیان ہوئیں اور جندشاپور میں ایک بہت بڑا دارالعلوم بنایا گیا جس میں حکمت فلسفہ اور ادب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور دور دور کے لوگ وہاں آکر اس سے مستفید ہوتے تھے۔

تہوار اور جشن قدیم ایرانی تہوار اور خوشی منانے کے بڑے شائق تھے۔ خصوصاً

اپنے بادشاہ کی سالگرہ کے دن بڑی دھوم دھام کرتے اس دن ایک بہت بڑا اور بارہ منقہ ہوتا۔ نذرین پیش ہوتیں اور شہنشاہ کی داد و دہش سے لوگ بالامال ہونے عوام الناس اپنے اپنے اچھے سے اچھے کپڑے پہن کر عیرون اور دوستوں سے ملنے جاتے۔ طرح طرح کے تماشے اور عین ہونے سرکون پر منہدی اور قسم قسم کے پھول اور قیاس ڈالی جاتیں اور ہر طرح خوشبوئیں سلگائی جاتیں۔

قدیم ایرانی چونکہ زراعت پیشہ تھے لہذا ان کے جشن بھی زراعتی ضروریات اور تغیر اوقات فصل چارگانہ پر مبنی تھے اور کسی خاص مہینے سے انہیں تعلق نہ تھا۔ علامہ ابوریحان البیرونی نے ان تہواروں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ مگر وہ زیادہ تر ساسانیوں کے عہد کے حالات لکھتے ہیں تاہم اس میں شک نہیں کہ مذکورہ دلیل جشن نہایت قدیم تھے۔ اور عرصہ دراز تک ملک میں مقبول عام رہے۔

(۱) نوروز۔ یہ قدیم زمانے سے ایران کا قومی تہوار ہے جسے آج کل بھی وہاں کے باشندے گو مسلمان ہیں مگر ہر سال مناتے ہیں۔ اس تہوار کو جمشید نے اپنے زمانہ حکومت کی یادگار میں اُس دن مقرر کیا تھا جب آفتاب برج حمل میں آتا ہے۔ ساعات شب و روز مساوی ہوتے ہیں۔ ہری پد کا آغاز ہوتا ہے۔

(۲) مارچ) اور بہار کی آمد آمد سے نباتات و حیوانات میں ایک نئی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے آغاز سال نو نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ قدیم زمانے میں نئے سال کی ابتداء زمانہ خزان سے شروع ہوتی تھی جبکہ جشن مہرگان ہوتا تھا۔ مگر

آج کل ایران کے پارسی اپنا سال نو چیتہ نور و زہی سے شروع کرتے ہیں۔
 (۲) مہرگان۔ فریدون نے جب دشمن قوم قضاک پر فتح پائی تو اُس کی خوشی میں یہ
 جشن منعقد کیا گیا جسے آج کل بھی تمام پارسی ہر سال مناتے ہیں اور تمہارے نیاز و نذر
 کرتے ہیں۔ یہ زمانہ وشتوبہ میں جب سورج بُرج میزان میں آتا ہے یعنی ۳ ستمبر کو
 شروع ہوتا اور چھ دن تک رہتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ مہرگان کے زمانے میں
 عید گو فو بیا یا گو جن (مغان کش) بھی منائی جاتی تھی۔ اس دن بقول مورخین
 یونان مغان اپنے گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ اگر وہ کہیں باہر دیکھ لیے جاتے تو ذلیل کہے
 جاتے۔ وجہ یہ تھی کہ اسی زمانے میں مجوس گومتا یعنی جھوٹا برہمہ جس نے سلطنت
 ایران کو غصب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ داراے اعظم کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یہ ایک
 امر اتفاقی تھا۔ ورنہ اُس کے مارے جانے کی خوشی میں کوئی خاص جشن نہیں مقرر
 کیا گیا۔ عجیب بات ہے کہ آج کل بھی ایران میں وربع الاول کو عید الزہرا ہوتی
 ہے جس میں شیون کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اور کوئی سنی باہر نکلتا ہے تو ذلیل
 و خوار کیا جاتا ہے۔

(۳) جشن سہدہ۔ یہ تہوار موشنگ کے آگ کو معلوم کرنے کی یادگار میں تھا۔ اس دن
 ہر گھر میں آگ روشن کی جاتی تھی۔ تمام آشکے اُس روز چراغان ہوتے تھے۔ اور
 جو حق جوگ لوگ عبادت کرتے آتے تھے۔ یہ تہوار صرن کیا نیون کے زمانے تک رہا
 اور موسم زمستان میں منعقد ہوتا تھا۔

(۴) جشن تیرگان۔ یہ تہوار موسم باران میں ہوتا تھا۔ اور کیا نیون کی ایجاد تھا۔ ستار
 تشر (یا شعرا) مہینہ اور خوشحالی کا دیوتا ہے وہ اپنے دشمن پوش (ورثہ) یعنی
 خشک سالی کے دیو پر فتح پاتا ہے۔ اور مہینہ برساتا ہے۔ مشہور ہے کہ منوچہر نے اسے
 قائم کیا تھا۔ بعد کے زمانے میں اناہتیا یعنی مینہ کی دیوی کے لیے بھی آبان میں ایک
 جشن ہونے لگا۔

(۵) جشن مُردگان۔ یہ تہوار بھی کیا نی کی زمانے سے شروع ہوا۔ عام عقیدہ تھا کہ سال
 کے آخری دس دنوں میں مُردوں کی روحیں دنیا میں آتی ہیں۔ اور اپنے عزیزوں
 سے نذر و نیاز کی خواستگار ہوتی ہیں اس لیے سب لوگ اس زمانے میں بڑی تیاریاں

کرتے تھے۔ ہر گھر میں ایک مخصوص جگہ مقرر کر دی جاتی تھی جہاں سب خاندان والے جمع ہو کر اپنے مُردوں کو نیاز و نذر چڑھاتے تھے۔

(۶) موسمی تہوار۔ سال کے مختلف موسموں میں چھ تہوار ہوتے تھے جن کا زیادہ تر تعلق زراعت اور کاشتکاری سے تھا۔ ہر تہوار پانچ روز تک رہتا تھا۔ ہر گاؤں اور ہر شہر کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کے دعوتیں کرتے۔ سفید کپڑے پہنتے اور اپنی حیثیت کے مطابق نذرین لاتے جنہیں پیر و بہت موسمی دیوتاؤں پر چڑھاتے اور دعائیں مانگتے تھے۔

ساسانیوں کے زمانے میں بھی یہ تہوار بڑے جوش و خروش کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ علامہ البیرونی نے لکھا ہے کہ نوروز کے دن بادشاہ ایک بڑا دربار منعقد کرتا۔ رعایا کی نذرین قبول کرتا اور اُن کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتا۔ بادشاہ کی طرف سے ایک بہت بڑی دعوت بھی ہوتی تھی جس میں بکثرت لوگ مدعو کیے جاتے اور طرح طرح کے تاج رنگ اور تماشے ہوتے۔ مہرگان کے دن ایک بہت بڑا میلہ ہوتا جو اس قدر مقبول ہوا کہ ایک ماہ تک قائم رہتا۔ اس میلے میں بادشاہ اپنے سر پہ ایک تاج جو اہر نگار رکھے جس پر آفتاب کی شکل بنی ہوتی تھی۔ برآمد ہوتا۔ ساسانیوں نے بعض تہوار خود بھی قائم کیے۔ مثلاً فیروز کی جب دعا مقبول ہوئی۔ پانی برسا اور ملک کا قحط اعظم دور ہوا۔ تو اس نے اس خوشی میں ہر سال ایک جشن منعقد کرنے کا حکم دیا۔

تفریحات جشن وغیرہ کے علاوہ ہمیں نہیں معلوم کہ عوام الناس کی تفریح طبع کے اور کیا سامان تھے۔ گراہیرون اور ریمسون کے لیے بکثرت دلچسپ مشاغل تھے۔ شکار کا خاص شوق تھا۔ اور وہ شیر۔ گورخ۔ بارہ سنگھ۔ جنگلی سور اور

عہ شکار کے شوق کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اس سے بوزی درندے کم ہو جائیں مذمبایہ بہت ثواب کا کام سمجھا جاتا اور اسے حاصل کرنا ہتھساروں کا عین فریضہ زندگی تھا۔ اگر کوئی بہادر سور کسی ہیبت جانور کو مارتا تو سارے ملک میں اُسکی شہرت ہو جاتی۔ لوگ اس کے قصے اور کہانیاں بنا ڈالتے۔ اور رفتہ رفتہ طرح طرح کی غلط روایتیں مشہور ہو جاتیں۔ چنانچہ محلات چھا منشی میں ایسے عجیب و غریب درندوں کی تصویریں نظر آتی

غزلوں کے پیچھے سرگردان رہتے تھے۔ کشتی گھوڑ دوڑ۔ تیرہ بازی۔ اور چوگان کا بھی عام رواج تھا۔ آج گانے اور موسیقی کا بھی بڑا ذوق تھا چنگ۔ چنگ۔ تار۔ قتل اور دیگر طرح طرح کے آلات موجود تھے۔ جوے۔ پانسے۔ اور تیرہ کا بھی شوق تھا۔ اور نوشیرون کے زمانے میں شطرنج بھی رائج ہو گئی تھی۔

اکل و شراب ابتداً امیر و غریب سب کی غذا نہایت سادہ تھی۔ بعد کے زمانے میں تکلفات اس قدر بڑھ گئے کہ ایرانی کھانے ساری دنیا میں مشہور ہوئے۔ غریب لوگ صرف سرسوں اور پانی پر گزارہ کر لیتے تھے۔ گھوٹ اور جو کا نہ یادہ رواج تھا۔ دلیا عام طور پر تنور میں بکتی تھیں۔ تیرہ کاری۔ دو دھم۔ اور گھی کے علاوہ گوشت سب کی عام غذا تھی۔ گھوڑے بیل۔ بھیڑ بکری۔ گھاس۔ فستق مرغ۔ اور تیرہ کا گوشت مرغوب تھا۔ بچھلی اور تیرہ پندون کا گوشت بھی کھایا جاتا تھا۔ بڑی بڑی دعوتوں میں گھوڑے اور بیل مسلم بکا کر دسترخون پر رکھ دیے جاتے تھے۔ ایرانی میوؤں اور پھلوں کے بڑے شائق تھے۔ کھجور اور انگور ان کے لاکھ میں بکرت پیدا ہوتے تھے۔ جن سے شرابیں بھی بنتی تھیں۔ آدستامین شراب کی تعریف کی گئی ہے۔ اور ہوا کی شراب نہ ہوتا مگر کبھی گئی ہے۔ اس لیے شراب کے سب شائق تھے۔ روزانہ کھانے کے ساتھ بچھ۔ اور تیرہ وارون میں تو میواری کی کوئی حد نہ رہتی۔

غریب لوگ زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا کھاتے۔ لیکن امرا میز اور کرسی پر بیٹھ کے سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتے تھے دعوتوں کے موقعوں پر اکل و شراب کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہتا۔ لوگ اپنے معاملات پر رات ہی کے وقت شراب پی کر بحث کرتے اور دوسرے دن پھر اُنھیں باقون پر غور و خوض کر کے باہم کوئی رائے قائم کر لیتے۔

عہدِ صفویہ میں جو نہایت سبب ہیں اور جن کا اس دنیا میں کبھی وجود نہ تھا۔ گرفتار بھی اسی قسم کا ایک جانور ہے۔ اس کے چار ہاتھ پیر ہیں جن کے پنجے شیر کے ایسے ہیں۔ دو صفیہ پر ہیں۔ عقاب کے مانند سر ہے۔ گردن نیلگون۔ سینہ اور پیر سرخ۔ اور اس کا مسکن کوہ و بیابان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سیاحت گشتا شپ۔ شکار بہرام گور اور شاہ نامے کے ہفت خوان رستم میں بھی عجیب و غریب جانوروں کا حال مذکور ہے۔

(ایران نامہ)

لباس و زیبائش

آریہ جردا ہے تھے لہذا جانوروں کی کھال اور اُن کے کپڑے پہنتے ہوں گے۔ سب سے پہلے بقول فردوسی تجشید نے اونی سوتی اور ریشمی کپڑوں کو ایجاد کیا۔ شمر یہ کسی قدر مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ قدیم ایرانی موجودہ زمانے کے بختیار یوں کی طرح لباس پہنتے ہوں گے۔ جن کا لباس ایک سوتی یا پوسٹینی کرتا ہے۔ جو گھٹنوں تک نیچا ہوتا ہے۔ اس کی آستین کلائیوں تک پہنچتی ہے۔ کمر میں ایک پٹیکہ ہے۔ سر پر ایک ڈھیلی ڈھالی نندے یا اون کی ٹوپی اور پاؤں میں جڑے کے جوتے ہیں۔ ساسانیوں کے زمانے میں عام لوگ سمور کی سفید ٹوپی یا پگڑی پہنتے تھے۔ مگر کندہ تصویروں کے دیکھنے سے پگڑی کا پتہ نہیں چلتا۔ امرائے ہخامنش کا ایک لباس جس میں میتدیا کے فیشن کا پورا اتباع کیا گیا تھا۔ نہایت پرتکلف تھا۔ اُن کے ریشمی اور پرتکلف کپڑوں پر طرح طرح کے جانوروں اور پھول پتیوں کی رنگین نیکیں بنی ہوتی تھیں۔ یہ جامہ اڑی یا ٹخنے تک لمبا ہوتا تھا۔ کمر سے نیچے اُس میں جھول دے کے چٹنیں ڈال دی جاتی۔ آستینیں کینوں تک تنگ اور نیچے بہت کشادہ اور شکن دار ہوتی تھیں۔ سر پر ایک چوکور ادبھی سی ٹوپی تھی جس کی دیواروں پر بھی چٹنیں پڑی تھیں۔ امرائے فارس کا اصلی لباس اُس سے کسی قدر مختلف تھا۔ وہ ایک جُست کوٹ پہنتے تھے جو گھٹنوں سے زیادہ نیچا نہ تھا۔ اُن کی ٹوپی کی شکل قبہ نما تھی۔ اور اُس کی دیوار پر شکنیں نہ تھیں۔ دونوں قسم کے لباسوں کے نیچے ایک شلوار نما ڈھیلہ پانجامہ پہنتے تھے۔ کمر میں ایک زرنگار مربع پٹیکہ ہوتا تھا جس میں ایک طرف خنجر لگا رہتا۔ کبھی خنجر کو جڑے کے ایک قسم میں لٹکا لیتے اور داہنی جانب ران پر پڑا رہتا تھا۔ اور بائیں جانب ایک بڑا سا خول ہوتا جس کے اندر کمان محفوظ ہوتی۔ پاؤں میں موزے اور جوتے تھے۔ کانوں میں بالیاں کلائیوں میں چوڑیاں۔ اور گلے میں بیش باطوق پہنتے تھے۔ انھیں چمڑوں سے اُن کے مرے اور عمدے کا اظہار ہوتا تھا۔ امرائے اپنے چہرے پر غارہ اور آنکھوں میں سرمے بھی لگاتے تھے۔

(باقی آئندہ)

انگلستان کی عورتیں

(حکم حقوق محفوظ)

(بقیہ صفحہ ۱۵۳)

(از مولانا شرم حرم و مغفور)

لہذا اُسی کی وجہ سے مجھے اُسکی معشوقہ سے بھی ملنے کا ہر موقعہ میں اتفاق ہوتا تھا۔
 میں دیکھتا تھا کہ چار لیس کو ہمارے بیان کے نوجوانوں کی طرح نہ کسی کھیل کا شوق
 نہ نہ کسی تماشے کا۔ رات دن میں اُسے سخت محنت کرتے دیکھتا تھا۔ کسی وقت اور کسی
 گھڑی میں اس کو سوا اس کے کہ روپیہ پیدا کرنے کی فکر میں مشغول ہوا اور کسی کام کی
 طرف متوجہ نہ پاتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ تھنڈر میں جانے کی خواہش ظاہر کی تو اُس
 نے انکار کیا اور کہا: مجھے اپنی شادی کی اس قدر فکر ہے کہ کسی کام میں دل نہیں لگتا
 میری معشوقہ مجھے کہیں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اور پھر اسی کی نہ بانی معلوم ہوا کہ
 وہ لڑکی بھی اپنے سینے پر رونے سے روپیہ پیدا کرتی ہے جمع کرتی جاتی ہے۔ جب ہم تنہا
 روپیہ جمع کر لیں گے کہ الگ گھر میں رہیں اور اپنی معشوقہ سے شادی کریں اس وقت
 دنیا سے لطف اٹھائیں گے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ شادی کا شوق اس لڑکے میں کس جوہر
 شریف کا پتہ دے رہا ہے۔ اور محض اسی وجہ سے اس کے اخلاق پر کتنا عمدہ اثر
 پڑا۔ اور یہی چیز اس کا بھی قوی سبب ہے جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں کہ وہ ان بدکاری
 اور بد معاشی نہ زیادہ تر سن رسیدہ لوگوں اور بڑھوں میں ہے۔ اور نوجوانوں میں کم
 ہے۔ یہی منکبت جن کا اوپر ذکر ہوا ایک دوسرے کے تھوٹا ہارٹ یعنی دل پر اکملائے ہیں۔
 اور فرصت کے اوقات میں باہم باغون اور خیر آباد جنگلوں اور کھیتوں میں جا کے ایک
 دوسرے کی صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ تو اُن کی شام کو آپ ذرا آبادی سے باہر نکل
 جاتے تو ہر جگہ انھیں سویٹ ہارٹوں کو بے تکلفی کے ساتھ گھاس پر اور درختوں کے
 نیچے بیٹھا اور ہم آغوش پائیں گے۔ یہ صحبت وہاں جائز خیال کی جاتی ہے۔ اور مان
 باپ بھی اپنے کاموں کا حرج کر کے بیٹھوں کو اُن کے سویٹ ہارٹ کے ساتھ جانے کی
 اجازت دیدیتے ہیں۔

آپ تعجب کریں گے کہ ان پر بدگمانی نہیں کی جاتی۔ اور جہاں تک میں نے خیال
 کیا یہ حسن ظن کسی حد تک اصلیت بھی رکھتا ہے۔ اس لیے کہ جب سے وہاں اس بات کو شہر
 ہو گئی ہے کہ کٹر لوگ لڑکیوں کو دعو کا دے کے بے عصمت کر ڈالتے ہیں۔ اور اس کے بعد شادی
 سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس وقت سے لڑکیاں خود اپنی عزت کی بہت نگہداشت کرنے لگی ہیں۔
 ان کے خیال میں یہ بات جھگڑی ہے کہ اگر خراب ہو جائے تو کسی اور سے خراب ہوں۔ مگر

اس کو بدگمانی کا موقع نہ دین جس سے کہ شادی کی امید ہے۔ اس خیال نے لڑکیوں کو اپنی عصمت بچانے پر بہت آمادہ کر دیا ہے۔ ان تمام باتوں کا اصل اصول یہی ہے کہ وہ ان یہ امر ہر شخص کے نزدیک قطعی طور پر فیصلہ ہو گیا ہے کہ عورت کی عصمت کے محفوظ رکھنے کے لیے بمقابلہ اس کے کہ دوسرے لوگ اور اوپر والے نگرانی کریں۔ یہ طریقہ نہ زیادہ مفید اور قابل اطمینان ہے کہ خود عورت اپنی عصمت بچانے کی ذمہ دار قرار دی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر عورت خود خراب ہونے پر آمادہ ہے تو کوئی ہزار کوشش اور نگرانی کرے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر عورت خود بچنا چاہتی ہے تو ہزار ہیکائی اور پھسلائی جائے نہیں خراب ہو سکتی۔ اس اصول پر وہ ان کا عمل درآمد ہے۔ اور اسی وجہ سے عورتیں روز بروز زیادہ مطلق العنان ہوتی جاتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو اس مطلق العنانی کا مستحق بھی ثابت کرتی جاتی ہیں۔

بکاح ہو جانے کے بعد لڑکے اور لڑکی کی زندگی بالکل بدل جاتی ہے۔ ان باپ کے گھر سے نکل کے وہ اپنا نیا گھر قائم کرتے ہیں۔ مکان کی صفائی اور آرائش اور خرچ کے بچانے اور کفایت شعاری کے اصول برتنے میں بی بی اپنی لیاقت اور قابلیت کے جوہر دکھاتی ہے۔ اور چونکہ مردان کا مون سے بالکل نا آشنا ہوتے ہیں لہذا قریب قریب اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ بی بی دالون کے خرچ میں بمقابلہ اُن لڑکوں کے کفایت پڑتی ہے جو تنہا رہتے ہوں۔ خانگی انتظام یا بچوں کی پرورش لڑکے کے مصارف اور حساب کتاب کلیۃً بی بی کے ہاتھ میں رہتے ہیں یہاں کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ جو کچھ کمزور لڑکے بی بی کے ہاتھ میں دے دیں۔ اُس میں سے جو کچھ بچتا ہے بی بی اس کو ہفتہ وار سیونگ بینک میں جمع کرتی رہتی ہے۔ صرف مکان اور بچوں کا صاف رکھنا بی بی کا فرض نہیں۔ اُس کو میان کے کپڑوں کی درستی اور صفائی کا بھی ہر وقت خیال رہتا ہے۔ وہ میان کے کپڑوں پر بُرش کرتی ہے اور میان کے بالوں میں اپنے ہاتھ سے بُرش اور لٹکھی کرتی ہے۔ اور جب شوہر کپڑے پہن کر کھڑا ہوتا ہے تو آگے پیچھے پھر کر دیکھ لیتی ہے کہ کسی چیز میں کوئی عیب تو نہیں۔ الغرض جس طرح میان مائیں اپنے بچوں کو نگھنی چوٹی کر کے اور بنا چنا

کے باہر نکالتی ہیں اس طرح وہ ان بی بی اپنے میان کو باہر نکالتی ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر قوموں کا یہ خیال ہو گیا ہے کہ انگریزی قوم سے ابھی بی بی کسی قوم میں نہیں لی سکتی۔

سو سائٹی میں شریک ہونے اور دعوتوں میں جانے کا جس قدر خیال شادی سے پہلے ہوتا ہے بعد نہیں باقی رہتا وجہ یہ کہ شادی سے پہلے مرد عورت دونوں اپنے لیے ایک عمدہ جوڑا فراہم کرنے کی جستجو میں ہوتے ہیں۔ اور ہر صحبت میں اسی خیال سے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ گرجوں اور عبادت خانوں میں جانے کا بھی زیادہ تر محرک یہی خیال ہوتا ہے۔ شادی کے بعد ان باتوں کا شوق کم ہو جاتا ہے۔ اور اگر جاتے بھی ہیں تو صرف میان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ بی بی کی دلچسپی ہو اور بی بی کی غرض یہ ہو بی بی کے میان طلب محبت میں زیادہ منہمک ہو کے خشک مزاج اور افسردہ دل نہ ہو جائے۔ بلکہ شادی کے پہلے سال میں چونکہ دو ملہا اور دھن کو دنیاوی لطف کا زیادہ شوق ہوتا ہے لہذا صحبتوں اور تھیلے دن میں کثرت سے جاتے ہیں۔ لیکن جو جو زمانہ گزرتا جاتا ہے ان باتوں کا شوق کم ہوتا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میان بی بی میں جیسی محبت وہاں ہوتی ہے ویسی محبت اور ممالک میں شاید کم ہوتی ہوگی۔ یہ مقولہ وہیں صادق آتا ہے کہ ایک کی راحت پر دوسرے کی راحت منحصر ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ طلاق کے مقدمات وہاں یہاں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن میں پچھتا ہوں کہ وہ وہاں کی آبادی کے اعتبار سے بہت کم ہیں۔ میرے اکثر انگلش دوست جب میرے سامنے ہندوستانیوں کی موجودہ طرز نکاح پر اعتراض کرتے تھے اور کہتے تھے کہ لڑکے لڑکی نے جب ایک دوسرے کو دیکھا ہی نہیں تو ان میں موافقت نہیں قائم رہ سکتی۔ ایسے اوقات میں میں یہ کہہ کے ان کو قائل کر دیا کرتا تھا کہ جو کچھ ہو ہمارے بیان اتنے طلاق کے مقدمہ نہیں ہوتے اس جواب پر وہ تیر ہو کے خاموش ہو جاتے تھے۔ اور ان سے کچھ جواب نہیں بن پڑتا تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اصلی حالات سے ان کو اطلاع نہ تھی۔ ورنہ اس کا جواب کوئی دشوار نہ تھا۔ اپنے حالات کو آپ خوب جانتے اور سمجھتے ہیں۔

اور آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے بیان عورت کی آواز گھر سے باہر تو نکل سکتی نہیں عدالت تک کیونکر پہنچے۔ شریف خاندانوں میں اس امر پر عمل درآمد ہے کہ لڑکی چاہے مہر جائے یہ اچھا ہے۔ اور یہ نہیں اچھا کہ اس کا نام اور اس کی آواز عدالت کی کرسی تک پہنچے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ شریفوں کے گھروں میں کتنی لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ جن کے مالائی اور ناپاک شوہروں نے ان کی طرف سے بے پرواہی اختیار کر لی ہے۔ اور وہ ایک بے زبانی کے ساتھ اپنی مصیبت ناک زندگی کو دن بھر ہی ہیں۔ وہ ان ایسی ایک لڑکی بھی نہ لے گی۔ جب آپ کے بیان بھی عورتوں کو آزادی دیجائے۔ اور ان کو عدالت سے دادخواہ ہونے کا موقع ملے تو معلوم ہو جائے کہ طلاق کے مقدمات بیان زیادہ ہوتے ہیں۔ یا وہ ان۔

انگریز مسان بی بیوں کی مذکورہ بالا زندگیوں سے بعض خرابیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں جو غالباً آپ کے خیال میں نہایت ہی بد نما ثابت ہوں گی۔ اول تو وہی جو میں اوپر بیان کر آیا کہ جوان دو لھا وطن اپنے بچوں کے گھر میں رکھنے کے مشکل اور بھجوری۔ دادا دار ہوتے ہیں دوسری طرف یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ ان کے دل خود اپنے ماں باپ کی طرف سے بھی سخت ہو جاتے ہیں۔ ان کو یہ گھڑی بھر کے لیے بھی نہیں گوارا ہے کہ ماں باپ کا پلنگ بھی اُسی گھر میں ہو جس میں وہ دن رات شوق ناز اور میان ناز برداری کرتے ہیں۔ غور طلب یہ امر ہے کہ یہ طرز زندگی اچھا ہے یا ہمارا ہندوستانی طرز کہ ایک ہی چھوٹے سے گھر میں پر دادا پردادی سے لے کے پر پوتے پر دتے تک اور دو تین خانہ واما دکھاتے میں بھرے ہوتے ہیں۔ ایک طرف ایک بڑی بی آنکھوں سے غدور چار پائی پڑ بیٹھی پنکھا ہار ہی ہیں۔ ایک طرف پوتہ ہونٹھے بچہ کے پوترے سے دھو رہی ہیں۔ ایک جگہ ساس بیوؤں کی مشہور زمانہ لڑائی کا سین نظر آ رہا ہے۔ ایک جگہ مذہب و بچوں میں طعنہ بازی ہو رہی ہے۔ ایک طرف بڑی ہوا اپنے دو برس کے بچے کو کوٹنے میں لے جا کے ایک برنی کی ڈلی اس طرح چھپا کے کھلا رہی ہے کہ گھر کا کوئی اور بچہ نہ دیکھ لے۔ اور دوسری

طرف نو جوان پوت داماد صاحب سب کی آنکھ بچا کے اپنی نئی نو بی وٹھن کے اشارے
 میں بوسہ لے رہے ہیں۔ یہ تو ایک ہندوستانی گھر تھا۔ اس کے مقابل میں ایک
 انگریزی گھر کو قائم کیجئے تو ایک دوسرا ہی سین نظر آئے گا۔ ایک کمرے میں میان
 اور بی بی اکیلے بیٹھے ایک دوسرے کی محبت سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ شراب کا دور
 چل رہا ہے بی بی اٹھ کے پیا نو بجاتی ہیں۔ میان گاتے ہیں کچھ دیر کے بعد بی بی بھی
 سر ملانے لگتی ہیں۔ اور آخر جوش میں آئے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ اور دونوں ایک
 دوسرے کے گٹے میں ہاتھ ڈال کے ناچنے لگتے ہیں۔ مان باپ دادا دای اور بیٹا بیٹی نوکر
 چاکر خدانے سب ہی کچھ دیا ہے گرہے کیا کہ دادا دای ہاتھ پاؤں سے حسد در
 ہو کے بیکار ہو گئے۔ اور جب کسی طرح کمانے کے قابل نہیں رہے تو درک ہوس (خراغی)
 میں لے لیے گئے۔ اماں باوا لندن کی کسی گلی میں ایک خراب سے مکان میں پڑے ہیں۔
 اس لیے کہ باو ادن کو ایک کارخانہ میں محنت کر کے روزانہ دو تین شلنگ کمانے ہیں اور
 اماں سلائی کرتی ہیں بچے اور ڈونگ ہوس میں بھی رہے گئے۔ نوکر چاکرین گرہے باورچی خانہ
 میں بیٹھے ہیں۔ جاسے جانیں تو آئیں اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کس گھر کو زیادہ پسند کرتے ہیں
 اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی گھر میں بچوں کی چل پون ساں ہوؤں کی جوتی پیراوند
 بھاد چون کی تو تو میں میں گھر کی ناپاکی ہو بیٹوں کی بدتمیزی سے آپ کی طبیعت پریشان
 ہو گئی ہوگی۔ اور اس کے مقابلہ میں انگریزی گھر کی صفائی میان بی بی کی پر جوش محبت
 بیفکری و آزادی دیکھ کے آپ کو بھی شاید حسد معلوم ہوا ہو گا۔ لیکن یہاں بھی ممکن
 نہیں کہ اس خود غرض اور نفس پرست جوڑے کی مستی ویش کے ساتھ ان کے
 مان باپ اور دادا دای کے جگر خراش میں نے آپ کا دل نہ دکھایا ہو وہاں گھر بھر
 میں بے تمیزی تھی تو یہاں بے تکلفی ہے۔ بلکہ غالباً آپ اپنے ہی گھر کو زیادہ پسند کریں
 گے۔ اور صانع کہہ دیں گے کہ بدتمیزی اس بے تکلفی اور ناخدا ترسی سے لاکھ درجہ
 اچھی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ مذکورہ انگلش طرز زندگی میں اگرچہ مان باپ اور
 خاندان کے بزرگوں پر بہت بڑا ظلم ہوتا نظر آتا ہے۔ مگر اس میں فوائد بھی بہت سے
 ہیں۔ لڑکا اپنی بی بی کو جو ہندوستان کی بی بیوں کی طرح جائدا غنیہ و منقہ نہیں
 ہے۔ ساتھ لے کے ساری فکر و دن سے آزاد ہو جاتا ہے اس کے دل میں الوا عز می کے

خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ اُن کی ہدایت کے مطابق آزادی اور بے فکری کے ساتھ دنیا کے ہر کونے میں جا کے اپنی قسمت کا خزانہ کھود نکال سکتا ہے۔ بی بی ان امور میں اس کے پاؤں کی زنجیریں دل کی دھڑکن کا تعویذ ہوتی ہے۔ جدھر وہ رُخ کرتا ہے اور ہر بی بی اُسکے دل کو تسلیاں اور بڑھادے دیتی ہوئی بڑے مزے کے ساتھ لے جاتی ہے۔ اور کہیں پر بہت نہیں ٹوٹنے دیتی۔ اگر دوسری فکر میں اور گھرانے کی خبر گیری اُسکے ذمہ ہو تو وہ کبھی ایسی جرأت نہ کر سکے جیسے کہ یوں سب کو چھوڑ کے اور بی بی کو کلیجے سے لگا کے وہ کرتا ہے۔

آپ اس سوانحار نہیں کر سکتے کہ انگلش لائف سے دنیا روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے اور ہندوستانی لائف سوورہ روز بروز پستی میں گرتی جاتی ہے اس خاندانی بھگتی اور بے پروائی ہی ہی انگلش قوم کو حقیقت میں زیادہ باجمیت بنا دیا ہے۔ وہ ان کا بی اور بیکاری یا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھنے سے زیادہ بڑا کوئی جرم ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اور شاید اس سے زیادہ ذلت کی کوئی چیز انگریزوں کی نظر میں نہ ہوگی کہ وہ کچھ کمانہ سکتے ہوں۔ اولاد سے تو کسی امید کا وہ ان اب خیال ہی نہیں باقی رہا ہے۔ درحقیقت ان باپ اولاد کو اپنی خبر گیری کا ذمہ دار ہی نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ اول تو یہ کوشش کرتے ہیں کہ مرتے دم تک محنت کیے جائیں اور خود اپنی کمائی پر بسر کریں۔ علاوہ برین بڑھاپے کے آخری دنوں کے لیے ہر شخص کچھ روپیہ بچاتا رہتا ہے۔ جو اُسکے کام آتا ہے۔ وہ مر جانا پسند کرتا ہے اور یہ نہیں گوارا کرتا کہ اولاد کی کمائی پر بسر کرے۔ اگر لڑکے دیں بھی تو وہ ان کے ان باپ لینا بچائی خیال کرتے ہیں۔ اور شاید اس وقت تک شاید وہ مادر ہی ایسے مان باپ ہوں گے جو بالکل مفلس ہو گئے ہوں۔ اور ان کو درک ہو س میں جا پڑا ہو۔ لہذا انگلش اولاد کی بے پروائی سے جو ظلم ہوتا تھا اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم میں غیبت و حسد زیادہ ہو گئی۔ والوالواری کے جذبات بڑھ گئے۔ یہ خلاف اس کے مشرقی خاندانی مٹلٹ کا نتیجہ یہ ہوا اور ہوتا ہے کہ قوم روز بروز پست ہوتی جاتی ہے۔ جو نوجوان کچھ کرنا چاہتے ہیں اور کر سکتے ہیں وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے۔

عورتوں کے مزاج میں چاہے وہ دنیا کے کسی حصہ اور کسی ملک کی ہوں ایک خاص مشابہت پائی جاتی ہے جس کا نمونہ انگلستان میں بھی صاف نظر آتا ہے ایک ایسی

قوم جس کی معاشرت ہر امر میں ہماری معاشرت سے جدا گانہ ہے۔ اور جس کی عورتوں کو باہر نکلنے اور ہر صحبت میں آنے جانے اور نیز بدرجہ زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ہماری عورتوں سے بالکل جدا ہونا چاہیے۔ مگر اس بارہ خاص میں اپنی اور ان کی عورتوں کو ایک ہی مذاق اور ایک ہی قسم کے خیالات کا دیکھ کے بڑی ہنسی آتی ہے۔ آپ نے غور کیا ہو گا تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ کبڑے اور زیور کا شوق شادی بیاہ کے تذکرہ اور اس امر کے دریافت کرنے کی سرگرمی کہ کس کا شوہر کیسا ہے اور کیا کماتا ہے۔ اور ان تمام باتوں کے ساتھ بہت سی فضول رسوم کی پابندی اور ہزار ہا قسم کی ضعیف الاعتقادیان طبقہ نسوان کے خصائص میں سے ہیں بعینہ یہ تمام باتیں وہاں بھی پائی جاتی ہیں یہ ضرور ہے کہ باہر نکلنے اور اخبارات کے دیکھنے سے ان میں چند اور قسم کے مباحث بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ اور خصوصاً جب مردوں میں بیٹھتی ہیں تو کوشش کر کے زیادہ تر انہیں مباحث کو چھیڑتی ہیں جن میں مردوں کی بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ مگر ان کا اصلی مذاق وہی ہے جو آپ کی عورتوں کا ہے۔ جب دو عورتیں مل کے بیٹھیں گی تو جان لیجے کہ اسی قسم کے معالما کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ صرف یہ تذکرہ ہی نہیں اس وقت تک ہزار ہا ضعیف الاعتقادیان ایسی موجود ہیں جو ان کی اصلی شریعت کی خبر دینی میں معمولی قاعدہ ہو کہ لڑکیوں کے سامنے جب کوئی اظہار محبت کرتا ہے اور شادی کی خواہش کرتا ہے تو ان کے دل میں بار بار دہرا رہ رہ کے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس کو دلی محبت ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ کے حل کرنے کے لیے لڑکیاں جہاں اور بہت سے ٹوٹکے کرتی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ کوئی پھول توڑ لیتی ہیں اور اس کی پھنکریاں ایک ایک کر کے اس طرح توڑنا شروع کرتی ہیں کہ ایک پرکتی ہیں "لوی" (مجھ سے محبت ہے) اور دوسری "پڑناٹا لوی" (مجھ سے محبت نہیں ہے) یہ دونوں جملہ ترتیب وار کرتی جاتی ہیں۔ اور پھلی پنکڑی کے ٹوٹنے پر جو جملہ کچھ وہی اصل اور حقیقت سمجھا جاتا ہے اس وقت تک سیرطری کے نیچے سے گزر جانا نہایت ہی مخوس خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن ہذا نقیاس یہ بھی مخوس ہے کہ شیشہ کے دروازہ کے اندر سے پہلو کا جانا دیکھا جائے بلکہ تاکید ہے کہ اگر اتفاقاً نظر آ جائے تو فوراً شیشہ توڑ کے جانے کو بلا واسطہ دیکھو اسی طرح کی اور بہت سی رسمیں ہیں۔ مگر تعلیم نے یہ فرق پیدا کر دیا ہے کہ لڑکیاں اور

نوعمر عورتوں میں یہ باتیں صرف مذاق اور دلگی کے طور پر بہن اور میں رسیدہ بوڑھی عورتوں میں عقیدت کے ساتھ وہ ان باتوں کو اسی سنجیدگی اور مشابہت سے بیان کرتی ہیں جس سنجیدگی سے کہ آپ کے بیان کی عورتیں بیان کرتی ہیں۔

مذہب کا خیال بھی عورتوں میں بہت زیادہ ہے۔ مرد موجودہ سائنس اور پچھلے فلسفہ کے اثر سے اس درجہ متاثر ہو گئے ہیں کہ ان میں مذہب کا خیال بہت کم رہ گیا ہے۔ لیکن زیر زمین چند نوجوان لڑکیوں کے سوا عموماً مذہب کی بہت باندھن ہر مذہبی رسم کو پوری پابندی اور سرگرمی سے ادا کرتی ہیں اور خود ہی نہیں مردوں کو بھی اس کی پابندی پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اتوار کا دن عام طور پر مقدس دن خیال کیا جاتا ہے۔ اس روز تمام ٹھیکر اور کل فروش گاہیں بند ہوتی ہیں سڑکوں پر بھی لوگ آتے جاتے کم نظر آتے ہیں گھوڑوں میں بیٹھتے ہیں اور فضول جوش پرستی کے کام کرنے سے بچتے ہیں بخلات اس کے یورپ کے اور ملکوں میں اتوار کا دن خاص عشرت اور مزے داروں کے لیے ہے ٹھیکروں اور بازاروں میں وہاں اتوار کو معمول سے زیادہ رونق ہوتی ہے۔ اگر بزدل کی نسبت یورپ والے ریاکاری کا الزام دینے اور کہتے ہیں کہ ان کے دل میں تو مذہب کی کچھ وقعت نہیں مگر صرف دکھانے کے لیے ان باتوں کی پابندی کرتے ہیں۔ اور جہاں تک میں نے غور کیا اس کی کسی حد تک اصلیت بھی پائی۔

سب سے زیادہ جو چیز چارے نوجوانوں کو وہاں متحیر کر دیتی ہے وہ وہاں کی عورتوں کی بے تکلفی ہے۔ وہ ہر مرد سے نہایت ہی آزادی اور بے تکلفی سے ملتی ہیں اخلاقی ضرورت سے ان کا فرض ہے کہ جس سے یسین کشادہ جبینی سے اور سکر کے کتنا بڑا اور کیا ہی نامحرم ہوا اس کے پاس بیٹھ جانے اور باتیں شروع ہوتے ہی بے تکلف ہو جانے میں ان کو تامل نہیں ہوتا اور ان کی بے تکلفی اس حد تک بڑھتی ہوئی ہوتی ہے کہ ہمارے ملک کے لڑکوں کا خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایک مرتبہ میں ایک دیہات کے آس پاس میں ہوا رہا کہ اپنے گھر کو آ رہا تھا اس روز جو کہانی برسرِ رات تھا اور رات کا وقت تھا۔ لہذا بچت پر کھلے میں بیٹھنے کی کسی کو حرجات نہیں ہوئی۔ سب لوگ اندر بھرے ہوئے بیٹھے اور صرف ۱۲-۱۳ آدمیوں کے بیٹھنے کی



قدیم تمدن ایران

بقیہ مضمون لباس و زیبائش

سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵۲ سلسلہ دنگل از اکتوبر ۱۹۲۷ء

اُن کی ڈاڑھی اور سر کے بال ملتے اور صاف ہوتے سر کے اوپر کے بال سیدھے ہوتے گر پیشانی سے لے کر گردن کی پشت تک گھونگر دار چٹکون کی قطار میں چلی جساتی تھیں۔ ڈاڑھی بہت گھنی ہوتی اور اس میں بھی ٹھڈی کے پاس کے بال گھونگر دار ہوتے۔ آخر کے زمانے میں مصنوعی بال بھی استعمال ہونے لگے۔ معمولی لوگوں کے بال چھوٹے ہوتے تھے۔ بعض تصویروں میں ڈاڑھی ان منڈی ہوئی معلوم ہوتی ہیں گر یہ غالباً خدام یا خواجہ سرا ہوں گے۔

عورتوں کی تصویریں مفقود ہیں اس لیے ان کے لباس کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ مگر ایک چینی سیاح نے ساسانی زمانے کی عورتوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بناؤ شکار اور مصنوعی آرائش کی بڑی دلدادہ تھیں۔ ایک ڈھیلا ڈھالا کرتا اور اُس کے اوپر چونہ پنتی تھیں بعض عورتیں ریشمی گون۔ تنگ پانچا اور ٹوپی اور جوتا زیب تن کرتی تھیں۔ سر کے بال نہایت خوبی کے ساتھ بنائے جاتے۔ سامنے کی زلفوں کا پیشانی کے اوپر ایک جوڑا باندھ لیا جاتا۔ مگر کچھ بال کھلے ہوئے پشت پر بکھر رہتے سونے چاندی کے خوشنما چھوٹے چھوٹے پھول بالوں میں پروتی تھیں۔ موتیوں کے ہار گلے میں پہنتیں۔ اس کے علاوہ قسم قسم کے میٹھا زیوروں سے اپنے جسم کو آراستہ کرتیں۔ آنکھوں میں سرمہ یا کاجل لگاتیں اور خوشبودار تیل سارے جسم میں لیتیں۔

ان پوشاکوں کے علاوہ ہر زرتشتی کے لیے مذہبی فرض تھا۔ اور پارسیوں میں اب بھی اس کا رواج ہے کہ اپنے سب کپڑوں کے نیچے ایک سفید سوتی کرتا پہنتے جسے سدرہ کہتے ہیں۔ اور کمر پر ایک ادنیٰ پٹکے باندھتے ہیں جو خاص طور سے بنایا جاتا ہے۔ اس پٹکے کا استعمال اب کم ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کے بجائے اب ایک سوتی دھاگے یا جینو متصل ہے جسے کشتی کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ زرتشت سے ایک زمانہ قبل ایران کے بادشاہ جشیہ سدرہ اور کشتی کو ایرانیوں کے امتیاز کے لیے رائج کیا تھا۔ چنانچہ اب بھی ہر لڑکے اور لڑکی کو سین بلورغ پر پہونچتے ہی اُن کے پر وہت یہ دونوں چیزیں خاص مذہبی رسوم کے ساتھ پہنانے ہیں۔

ایران میں سفید رنگ مبرک اور سیاہ ماتی سمجھا جاتا تھا۔

شکل و شباهت

تمام اقوام عالم میں مشہور اور ممتاز تھی۔ قدیم ایرانی آج کل کے گروہوں کی طرح نہایت چہرہ اور تنومند ہوتے تھے۔ اُن کا قد لمبا۔ جثہ نہایت مضبوط اور مائل بہ فربہی تھا چال ڈھال سادہ اور شاندار۔ آنکھیں بڑی اور چمکتی ہوئی۔ بلند پیشانی ناک لمبی اور سیدھی۔ اوپر کا ہونٹ پتلا اور کسی قدر خمیدہ۔ ٹھڈی گول۔ چہرہ بخمدہ اور شریفانہ اور رنگ گورا تھا۔ یونانیوں نے خشیارشا اور داریوش کی شکل و صورت کی بڑی تعریف کی ہے۔ عورتوں کا حسن بھی مشہور تھا۔ مورخ تریخون لکھتا ہے کہ میدیائی عورتیں اپنے حسن و جمال اور قد و قامت کے لحاظ سے ساری دنیا میں بے مثل اور بے نظیر تھیں۔ زنان بابل و اشور یا مائل بہ فربہی تھیں اُن کا جسم دھرا تھا چہرہ کسی قدر گول اور آنکھیں مثل آہو بڑی اور نہایت دلکش تھیں عورتوں کی خوبصورتی میں تناسب اعضا۔ نازک کمر۔ گورا رنگ۔ دھرا جسم۔ بھرا ہوا سینہ اور نازک انگلیاں قابل تعریف سمجھی جاتی تھیں۔ فردوسی ایرانی حسن کی اس طرح تعریف کرتا ہے:-

دوا بروکمان و دو گیسو کند	بیا لاکر و اسر و بلند
دور خسار ز بانش مجو قمر	دو چشمش ستارہ بوقت خ
بنا گوش امیدہ خورشید وار	فروخت ز حلقہ گو شوار
لبان از تبر زربان از فکر	دانش مکمل بدر و گہر

دہان و لبش بود گوہر فشان سخن گفتش بود گوہر فشان

فرشتہ بخوی و جو عنبر بوی بدل مہربان و بجان مہر جوی

خصائل و عادات

تھے۔ اُن کے دشمن یونانی بھی اُنھیں مودب ترین قوم کہتے تھے۔ وہ جسم کی برہنگی کو بہت میوہ سمجھتے۔ مجلسوں اور محفلوں میں کم سختی بلکہ خاموشی اختیار کرتے۔ اور دسترخوان پر بھی زیادہ گفتگو سے پرہیز کرتے تھے۔ بوقت طعام نہ ادر ادر دیکھتے اور نہ ہاتھ برکتے اور پھیلاتے بلکہ جو کچھ سامنے رکھا ہوتا اُسی پر اکتفا کرتے۔ راستہ چلتے اور کوچہ و بازار میں کھانا بڑا عیب سمجھتے۔ بار بار پیچھے مڑ کے دیکھنا بھی بُرا سمجھا جاتا۔ زور سے ہنسنا یا قہقہہ لگانا بڑا جانتے اور اُن حرکات ناشائستہ سے جو دوسروں کی دل آزاری و کراہت کا باعث ہوں ہمیشہ پرہیز کرتے۔ مورخ ہرودوٹس لکھتا ہے کہ راستہ میں ہم مرتبہ شخص اگر ملے تو بغل گیر ہو کر بوسہ دیتے۔ اگر ایک شخص رتبہ میں کم ہوتا تو بڑا چھوٹے کے رخصسہ کو چومتا۔ اگر ادر بھی کم درجے کا ہوتا تو سودا بانہ سامنے جھک جاتا۔ وفاداری۔ دوستی و استقامت ان کے خصائلِ حسنہ تھے۔ راستی و پاک بازی صفات اہر مزدی خیال کی جاتی تھیں۔ دروغ گوئی بدترین عیب تھا۔ اور اس کے بعد قرض لینا مکروہ سمجھا جاتا کیونکہ اس سے آدمی جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اسی لیے قدیم ایرانی تجارت اور لین دین سے بھی نفرت کرتے تھے۔ مگر وہ لوگ معاملے کے بڑے پکے تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر عہد کر لیا یا بعد میں قسم کھائی تو اُسے پورا کرنا اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔ اداسے احسان کا بھی بہت خیال تھا۔ اور دعا کے وقت صرف اپنی ہی آسودگی و بہبودی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ تمام اہل وطن اور بادشاہ کے فلاح و سائنس کے لیے ہر مزد کے حضور میں استدعا کرتے تھے۔

قدیم ایرانی بڑے فیاض اور مہمان نواز تھے۔ لیکن مصرف اور فضول خرچ بھی تھے۔ کھانے پینے میں خوب روپیہ لٹاتے تھے۔ ان کی ذہانت اور حاضر جوابی مشہور تھی مگر طبیعت میں خود داری اور گھمنڈ زیادہ تھا۔ ضبط کا مادہ کم تھا۔ اور حالت پریشانی و افلاس میں ذلت گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ دلیر اور جفاکش تھے۔ شہسواری۔ سیر و شکار اور جنگ جوی میں اُنھیں بڑی خوشی ہوتی۔ امرا کے علاوہ عام لوگ نہایت باہادی

کی زندگی بسر کرتے۔ جس میں تن آسانی اور عیش و عشرت کو بہت کم دخل تھا۔ مگر چون
 جون زمانہ گزر گیا ان عمدہ خصائص میں کمی آتی گئی۔ دولت و ثروت نے ابتدا
 میں جان ہند بیاوشاستگی پیدا کی آخر میں اُسی نے امیر غریب سب کو عیش پسند
 بنا دیا۔ وہ سُست اور کابل ہو کر غفلت میں پڑ گئے جس کی مثال میدیہ کی بارہنچ
 پیش کرتی ہے کہ فقط ڈیڑھ سو برس بعد سلطنت ہاتھ سے نکل گئی۔ بعد ازاں پنجش
 کا زمانہ آیا۔ اور وہ بھی کچھ دنوں کے بعد اسی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ اور یونان
 میں جب سکندر اعظم کا عروج ہوا تو وہ لوگ ویسے ہی پست ہو گئے تھے۔ جیسے
 ہندوستان کے باشندے جن پر غیر قوم نے ایسی آسانی کے ساتھ تسلط حاصل کر لیا
 داراے سوم کی رعایا کے دنوں سے غیرت و ہمت کے جذبات مفقود ہو چکے تھے۔
 قوی الجثہ اور دلیر اس وقت بھی تھے۔ مگر اخلاقاً اتنے پست ہو گئے تھے اور
 استقلال و ارادے میں ایسی کمی آگئی تھی کہ دشمن نے بہ آسانی مغلوب کر لیا۔
 پھر جب دولت و حکومت غائب ہو گئی اور سارے پانچ سو برس تک غلامی کی
 مصیبتیں جمیل چکے تب کہیں حب الوطنی نے پھر جوش اُرا۔ ذلت و خواری نے پرانے
 جذبات کو پھر اُبھارنا شروع کیا۔ اور وہ اپنے ملک کے پھر مالک ہو گئے مگر قوم
 پارہتیا (اشکانی) کے اختلاط سے ان میں ایسی جہالت اور ایسا اُجڑ پن آ گیا
 تھا جو عہد پنجانش میں نہ تھا۔ جسمانی اور ظاہری حالت کے دیکھتے ساسانی اپنے
 اجداد سے کچھ کم نہ تھے۔ مگر دماغی اور روحانی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت گرا
 ہوا تھا۔ ان میں وہ شائستگی اور شرافت نہ تھی جو ان کے بزرگوں کی طبیعت
 کا خاصہ تھی۔ وہ عیش پسند اور خوش طبع تھے سیر و شکار کے شائق تھے۔ مگر
 ان کی قوت ارادی کمزور تھی۔ اُنھیں اپنے جذبات پر پورا قابو نہ تھا۔ استقلال
 اور بردباری کی کمی تھی۔ مزاج میں تلون آ گیا تھا۔ دفعۂ جوش میں آ جاتے
 مگر بعد میں فوراً ہی ٹھنڈے پڑ جاتے۔ چنانچہ دور میں بلند نظری اور وسعت
 خیالی تھی۔ تعصب کم تھا اور دیگر قوموں کی اچھی باتوں کو بہت جلد اور خوشی
 کے ساتھ اختیار کر لیتے تھے۔ ساسانی سخت تنگ دل اور متعصب تھے اور
 بے سمجھے بوجھ دوسروں کی نقل کرنے لگے۔ اپنے اجداد کی طرح ان میں بھی عام

طور پر بادشاہ پرستی کا مادہ بہت زیادہ تھا اور بادشاہ کے عادات و اطوار کا ان پر بہت جلدی اور بہت بڑا اثر پڑتا تھا۔ اگر وہ نالائق اور بزدل ہوتا تو وہ بھی کم ہمت اور بے غیرت ہو جاتے۔

ہخامنشی زمانے کے خلاف اب ان پر پر و ہتھون کا بھی بڑا اثر ہو گیا تھا۔ جس سے عوام کی باطل پرستی حد درجہ بڑھ گئی اور انھیں دونوں وجوہ سے طبائع کی آزادی۔ جدت اور شخصیت بھی غائب ہو گئی۔ غرض جتنا زمانہ گزرتا گیا ان کا مذاق بیہودہ اور عادات ناشائستہ ہوتی گئیں۔ انتظامی قابلیت اس درجہ مفقود تھی اور جب الوطنی ایسی غائب ہو گئی تھی کہ ان کی عظیم الشان سلطنت کا چند ہی سال میں ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

قدیم ہندوستان میں تعلیم

(از مرزا احسان احمد بی۔ اے۔ علیگ)

قدیم زمانہ میں ہندوستان علم کا مرکز اعظم تھا۔ دنیا کا ہر گوشہ اس کی علمی شہرت سے گونج رہا تھا۔ یونان۔ چین۔ جاپان۔ سب اس کے خوانِ کرم کے زکّہ رہا تھے۔ قیثا غوث اور آلبیر دنی ایسے ماہرین فن دور و دراز ملکوں کا سفر کر کے برہمنوں اور رشیوں کے سامنے نانوے اوبتہ کرتے اور علم کے سرچشمہ ابدی سے سیراب ہوتے تھے۔ غرض کہ ہندوستان کا آفتاب علم اُس وقت نصف النہار پر تھا۔ جبکہ مغرب تمدن کے نام سے بھی آشنا تھا۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ان قدیم معلمین کی کیا خصوصیات تھیں؟ جن کے شوق میں دنیا کے بڑے بڑے ماہرین فن کھینچے جاتے تھے۔ ان کے شاگرد ان سے کیا تعلقات رکھے؟ ان کا طریقہ تعلیم کیا تھا۔ اس موضوع پر ہمارے ایک معزز ہندو پروفیسر نے انگریزی میں ایک مختصر سا رسالہ لکھا ہے۔ جو ہمارے اس مضمون کا اصلی ماخذ ہے۔

عہ یونان کا ایک بہت بڑا فلسفی تھا۔

استاد اور شاگرد کے باہمی تعلق

قدیم ہندوستان میں اساتذہ نہایت قد و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بے شبہ ان کو خواہیں بہت کم ملتی تھیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود ایک غفلت قانع کی طرح پُرا میں زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اور ہر قسم کے نفسانی حظوظ سے قصداً مجتنب رہتے تھے۔ تاکہ وہ بے مطالعہ میں کسی شتم کا خلل نہ ہو۔ آج کی طرح وہ شاندار محلول میں زندگی نہیں بسر کرتے تھے۔ بلکہ مسموئی جھوپڑوں میں بٹھ کر طلبہ کو درس دیتے تھے۔ اور ایسے افراد پیدا کرتے تھے جن کے ہر قدم پر علم شمار ہوتا ہوا چلتا تھا۔

استاد کے عام صفات اور خصوصیات کے متعلق یہ مین ہے۔
 ”وہ جو علم کا مخزن ہے۔ جو اپنے شاگردوں کو یہ محسوس کرا سکتا ہے کہ وہ ان کی والدین سے ان کی ذات کا کم ہی خواہ نہیں ہے جس کے اظہار زندگی سادہ اور پاکیزہ ہیں۔ جو اپنے شاگردوں کو اس طرح تعلیم دیتا ہے کہ ”گو یادہ واقعی حق کے متلاشی ہیں جو ایک انسان قانع ہے اور مثل مہمان کے شاد و خندہ جبین رہتا ہے۔ اور اپنے روزانہ فرائض کو نہایت پابندی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ یہی وہ افراد ہیں جو ان لوگوں کو تعلیم دے سکتے ہیں جو ان کے پاس آتے ہیں۔ اور درسگاہوں کو اپنا وطن بنا لیتے ہیں۔“

اسی قسم کے اور بہت سے اقوال دید میں موجود ہیں۔ مثلاً
 ”اچھا استاد وہ ہے جو مثل آفتاب کے ہر جنبہ کو اپنے اصلی رنگ میں ظاہر کرتا ہے اور مشق و تربیت کے ذریعہ سے اپنے شاگردوں کی مخفی قوتوں کی حفاظت کرتا ہے جس کا چال چلن نہایت قابل عزت ہو۔ جو راست گو اور وفاکش ہونے کے علاوہ خوبصورت ہو جس کی روح نہایت پاکیزہ ہو جس کا حافظہ نہایت قوی ہو۔“

یا مثلاً

”اچھا استاد وہ ہے جو مثل آفتاب کے زمین کو تمام طرف سے ہوزن رکھتا ہو۔“

زندگی بسر کرتا ہے۔ اور مثل بادشاہ کے ہر شخص کا دوست اور رہنما ہے۔ جو مثل اُن سپاہیوں کے جو دوسروں کی بھلائی کے لیے جیتے ہیں۔ صاف دل اور بہادر ہے اور مثل ایک وفادار بیوی کے پاکیزہ اخلاق والا ہے۔

یہ استاد کی عام خصوصیات کا بیان ہے۔ لیکن عملاً دو قسم کے استاد تسلیم کیے جاتے تھے ایک تو وہ جن کے شاگردوں سے ذاتی تعلقات ہوتے تھے۔ اور جو اُن کے لیے معلم اور رہنما کام دیتے تھے۔ یہ لوگ آجاریہ کہلاتے تھے۔ جن کی تعریف منو نے ان الفاظ میں کی ہے۔

لوگ اس برہمن کو آجاریہ کہتے ہیں جو اپنے شاگرد کو بچہ کچھ اور رہا یہ کے دید کا تعلیم و تلقین کرتا ہے۔

دوسرے وہ جو اُپادھیار کہلاتے تھے جو اپنی معاش کے لیے دیر کے ایک حصہ یا اُنس کی بھی تعلیم دیتے تھے۔

ان بیانات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ قدیم ہندوستان میں استاد و شاگرد کے باہمی تعلقات کس قدر حقیقی الفت و محبت میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ اس مسئلہ کے متعلق ہندوؤں کے متقن اعظم منو نے خالص زور کے ساتھ لکھا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب کے دوسرے باب میں لکھتے ہیں۔

استاد کو خواہ وہ کھیت میں ہوا۔ یہ الفاظ استعمال نہ کرنا چاہیے جن سے دوسروں کو غیر معمولی صدمہ پہنچے۔ اس کو تو لایا عملاً دوسروں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانا چاہیے۔ اس کو ایسی تقریریں نہ کرنا چاہیے جو دوسروں کو اس سے خوف زدہ کر دیں۔ کیونکہ اس کے حصول بہشت میں مانع ہوگا۔

اب طلبہ کے فرائض سنیں۔

شاگرد استاد کا نہایت احترام کرتے۔ ہر روز تلامذہ استاد کو سلام کر کے سبق شروع کرتے اور سلام کے بعد ختم کر دیتے۔ اور ہمیشہ اس کی خدمت میں مشغول رہتے اور استاد جب کبھی قریب آتا تو تعظیم کھڑے ہو جاتے استاد کی جگہ نہایت مقدس خیال کی جاتی تھی۔ اور طلبہ اس پر بیٹھنے کی کبھی جرأت نہیں کرتے تھے۔

۱۰ اصول ہنسا وغیرہ وغیرہ ۱۱ مہ مہنی علوم۔ ۱۲ ان علوم کی شاخیں جن کا خروج ویر ہے۔

ایک دوسرے مقام پر منو لکھا ہے۔

”جس طرح ایک آدمی بھاؤٹے سے زمین کو دگر بانی حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح ایک فرمان بردار شاگرد اس علم کو حاصل کرتا ہے جو استاد کے اندر مخفی ہے۔“

یہ تھے باہمی تعلقات استاد و شاگرد کے جو اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بالکل کم ہیں۔ آج تمام عالم پر خود غرضی کا ابرجھایا ہوا ہے۔ نہ استاد کی نگاہوں میں وہ محبت آمیز کشش ہے۔ نہ شاگردوں میں وہ جوش اطاعت۔ یہی وجہ ہے کہ آج گواکتاب علم کے ہزاروں ذرائع موجود ہیں جن سے قدیم دنیا بالکل خالی تھی۔ تاہم ہم میں علم کی حقیقی روح نہیں پیدا ہوتی۔ اور پیدا کیونکر ہو؟ قدیم زمانہ میں استاد و شاگرد کرات دن کا ساتھ رہتا تھا۔ آپس میں محبت و یگانگت تھی۔ خود غرضی کا پردہ حائل نہ تھا۔ اس لیے شاگرد و استاد ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے تھے۔ اور استاد کو جو کچھ معلوم ہوتا تھا بے کم و کاست وہ سب شاگرد کو بتا دیتا تھا۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ استاد و شاگرد کے درمیان میں کوئی خاص رشتہ ایجاد و ارتباط نہیں۔ دن رات میں محض چند گھنٹوں کا ساتھ رہتا ہے۔ اور وہ بھی طوعاً و کرہاً ایسی حالت میں طلبہ کے دل و دماغ پر استاد کی شخصیت اور اس کے اخلاق و عادات کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک استاد و شاگرد میں باہمی الفت نہ پیدا ہوگی اس وقت تک شاگرد استاد کی ذات سے کابل طور پر مستفید نہیں ہو سکتا یعنی اس علم کو نہیں حاصل کر سکتا۔ جو استاد کے اندر مخفی ہے۔ اس لیے اگر ہم حقیقی علم سے سیراب ہونا چاہتے ہیں تو ہم کو استاد کی زندگی کا ایک جز بن جانا چاہیے۔ فلک بوس کالچون کے رہنے والوں کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ سقراط جھوڑوں میں بیٹھ کر درس دیتا تھا۔ اور ارسطو اور افلاطون ایسے عالی دماغ شاگرد پیدا کرتا تھا۔ جن کے علمی کارنامے اب تک دنیا میں یادگار ہیں اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ علم کا حقیقی منبع کالج کی بند عمارتیں نہیں۔ بلکہ صرف استاد کی ذات ہے اس لیے جب تک شاگرد اس ذات سے پرست و کجمان نہ ہو جائے اس وقت تک حقیقی علم کے دروازے اس پر بند ہیں یہی وہ سطح نظر تھا جس نے قدیم ہندوستان کو اس وقت علم کا مرکز اعظم بنادیا۔ تھا جبکہ یورپ جو اس وقت ہندوستان کو ایک جاہل اور وحشی ملک خیال

کرتا ہے۔ وحشت و بربریت کا پیکر محسوس تھا کیا ہمارے لیے یہ قدیم سطح نظر قابل تقلید نہیں بہر حال حقیقی علم کے لیے استاد و شاگرد میں اسی قسم کے باہم خلوص آمیز تعلقات کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ قدیم ہندوستان کے استاد و شاگرد کے درمیان میں قائم تھے۔

(۲) بچے کی پرورش و تربیت

یہ مسئلہ جس قدر اہم اور توجہ کے قابل ہے اسی قدر ہمارے ملک میں اس کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے اسی لیے بچوں کی صحت جسمانی میں جو تمام دماغی اور روحانی ترقیوں کا اصلی سرچشمہ ہے قبل از وقت ضعف و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ دنیا کے لڈائز سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں اس لیے والدین کا سب سے بڑا مقدم فرض یہ ہے کہ بچوں کی صحیح طور پر پرورش و تربیت کریں تاکہ ان کی جسمانی صحت برابر قائم رہے اور وہ دماغی مشاغل کو کامل طور پر انجام دے سکیں۔ قدیم ہندوستان میں جس احتیاط جس ساز و سامان کیساتھ بچوں کی پرورش و تربیت کی جاتی تھی انصاف یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔

قدیم زمانہ کے رشی جو زندگی کو سب سے زیادہ اہم چیز سمجھتے تھے۔ ان کا اصلی مقصد لڈائز زندگی سے کامل طور پر مستفید ہونا تھا اس لیے اُنھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے بہت سے اصول مرتب کیے تھے۔ جو عملاً ملک میں چاروں طبقوں رائج تھے۔ سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ بچوں کی پرورش اور ابتدائی تربیت کے متعلق اُنھوں نے کیا اصول قائم کیے تھے۔

یہ مسلہ ہے کہ والدین کا جس قدر اثر بچوں کے دل و دماغ پر پڑتا ہے اتنا کسی کا نہیں پڑتا۔ اخلاق و عادات صحت و تندرستی طرز معاشرت غرض والدین کے حرکات و سکنات کی ایک ایک اداسہ بچہ متاثر ہوتا ہے اس لیے سب سے پہلے رشیوں نے والدین کے طریق زندگی کے متعلق مختلف اصول قائم کیے جن میں ایک یہ تھا کہ ان کو ایسی غذا میں استعمال کرنی چاہیے جو ان کے صحت جسمانی کے لیے مضر نہ ہوں۔ کیونکہ بچہ پر والدین کی صحت کا اثر نہایت غیر معمولی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان

صفات کا تذکرہ جن کی تعلیم بچوں کو عمد طفولیت ہی سے دینا چاہیے مثلاً حلم و عفو محبت و ہمدردی خصوص و ایثار زہد و تقویٰ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن بچہ کے اخلاق و عادات پر مان کا نسبتاً بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ بچہ کی زندگی میں ایک قول ہے وہ ہاتھ جو گوارہ کو جنبش دیتا ہے دنیا پر حکومت کرتا ہے۔ اس لیے ریشیوں نے بچہ کی اس معلمہ اول کے طریق معاشرت کی طرف خاص طور پر توجہ کی جس کا اثر وضع محل ہی کے زمانے سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بچہ کے لیے ان نو مہینوں میں مان جو کچھ کر سکتی ہے دنیا کی کوئی یونیورسٹی یا چرچ زندگی بھر میں بھی نہیں کر سکتا۔ ذیل کے اقوال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں اس مسئلہ کے متعلق لوگوں کے کیا خیالات تھے۔

(۱) رحم خراب ہو جاتا ہے اگر مان اپنی قوت سے زیادہ کام کرتی ہے۔

(۲) اگر مان ادھر ادھر بیکار گھومتی ہے تو بچہ کمزور ہو جاتا ہے۔

(۳) اگر وہ بہت زیادہ سوتی ہے تو بچہ کال ہو جاتا ہے۔

(۴) اگر مان شراب پی پی ہے تو بچہ کا دماغ نہایت پریشان اور منتشر ہو جاتا ہے۔

(۵) ایسی غذاؤں کے کثرت استعمال سے جن سے کوئی خاص بیماری پیدا ہو۔ بچہ میں بھی وہی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔

(۶) اگر حاملہ عورت بادشاہوں کے دلہنے کی خواہش رکھتی ہے تو بچہ نہایت اقبال مند

ہو گا اگر وہ جو گیون اور فیروں کے خیالات میں محو رہتی ہے تو اس کے بچے نہایت پاکیزہ و خرم ہوں گے۔ اگر بڑے آدمیوں کے سوانح زندگی اس کے پیش نظر رہے

ہیں تو بچہ بھی اسی قسم کا پیدا ہو گا۔

یہ محض زبانی تعلیم نہ تھی بلکہ ریشیوں نے اس کے متعلق عملی اصول منضبط کیے تھے جن کی باقاعدہ عام طور پر تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ ریشیوں نے زمانہ عمل کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پہلے حصہ میں مان کی جسمانی طاقت کا خاص طور پر لحاظ کیا جاتا تھا اس زمانہ میں جو حمل سے دوسرے یا تیسرے مہینہ سے شروع ہوتا ہے۔ ان کو مختلف دو ایندین دی جاتی تھیں۔ اور والدین مجمع عام میں اس اقرار کا اعلان کرتے تھے کہ وہ اس وقت سے ہمیشہ نہایت پاکیزہ زندگی بسر کریں گے۔ اور ایسی غذا میں استعمال

کرن گے جو رحم کے لیے مضر نہ ہوں اور اپنے کو اس طرح رکھیں گے کہ بچہ کے جسمانی نشوونما میں کوئی خلل نہ واقع ہو۔

دوسرے حصہ میں ان کی دماغی حالت کا خیال کیا جاتا تھا اس زمانہ میں جو قسم ادا کی جاتی تھی وہ یہ تھی۔ شوہر بیوی کے بالوں میں کنگھی کرتا۔ بیوی کی نظر ایک پیالہ پر جو پکے ہوئے دال چانول سے لبریز ہے جمی ہوئی ہوتی اور وہ اسی میں خاص شکل کا تصور کرتی۔ جس کا اثر وہ بچہ پر ڈالنا چاہتی اور آخر میں تمام فضا سے مکانی کو جان نغموں سے جو بلند شریفانہ اور روحانی جذبات سے لبریز ہونے میں مہمور کر دیتی۔

ان ابتدائی مراحل کے بعد جب بچہ کی پیدائش کا وقت آتا۔ تو ایک وسیع اور ہوا دار کمرہ انتخاب کیا جاتا۔ جہاں مختلف قسم کے لطیف ساز و سامان موجود رہتے مثلاً خوشبو، سفید کپڑے۔ شہد لکھی وغیرہ وغیرہ بچہ پیدا ہوتا تو وہ ایک ایسے عالم میں قدم رکھتا جس کی آب و ہوا ستراپارہ و حانیت سے لبریز ہوتی بڑے جوش و عاؤن کی صدا میں بلند ہوتی۔ اور سنتروں کے مقدس نغمے ہر طرف سے گونجتے۔ غسل کے بعد بچے کے کان میں یہ روحانی فقرہ کہا جاتا۔ تو بد (یعنی علم و وحانی) ہے تو اس واسطے پیدا کیا گیا ہے کہ خدا کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد بچہ کے فلاح و ترقی کے لیے دست و عاملند ہوتا۔ اور یہ رسم ختم ہو جاتی۔

دس دن تک متواتر بچہ کی اخلاقی اور جسمانی فلاح و ترقی کے لیے دو عاملین مانگی جاتیں۔ گیارہویں دن خاندان کے اعضاء اجباب جمع ہوتے۔ اور نہایت غور و خوض کے بعد بچہ کا نام رکھتے۔ جو سونزدن۔ شیرین۔ اور بامعنی ہوتا۔ دو چار مہینے کے بعد ایک دوسرا مفید سبق دیا جاتا۔ جس کی اہمیت کو ہم لوگوں نے آج بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

بچوں کی فطرت میں اثر پذیر ی کا بہت زیادہ مادہ ہوتا ہے پھول پتے۔ ہبزہ

زار۔ آباروان۔ چاند سورج۔ ستارے غرض عالم کائنات کی ہر چیز کو بچہ نہایت حیرت آمیز شوق کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بچوں کی یہ قدرتی خواہشات اکثر نہایت بے رحمی کے ساتھ دبا دی جاتی ہیں۔ اور ایک مدت دراز تک ان کو ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں زندگی بسر کرنا ہوتی ہے جہاں روشنی اور ہوا کا بھی شکل سے

گزر رہا ہے۔ لیکن ریشیون کو یہ خوب معلوم تھا کہ بچوں کے قدرتی خواہشات کے دبا
 دینے سے ان کے نشوونما میں نقص آ جاتا ہے۔ اس بنا پر ریشیون نے اس مسئلہ پر
 خاص زور دیا ہے یعنی والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ بچوں کو کھلی ہوئی ہوا میں باغ
 و سبزہ زار وغیرہ کی سیر کرائیں اور ان کی توجہ کو قدرت کی چیزوں کی طرف مبذول
 کرائیں تاکہ ان کے حواس کی شروع ہی سے تربیت ہوتی رہے۔ اور ان میں صحیفہ
 قدرت کے مطالعہ کا مذاق پیدا ہو جائے۔ اور گرد و پیش کی چیزوں کی ماہیت پر
 غور کر سکیں غرض اس زمانہ سے برابر مناظر قدرت کی سیر بچوں کے ابتدائی تعلیم و
 تربیت کا ایک بہت بڑا جز خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن آج کل کے بچوں کی تو یہ حالت
 ہو کہ ایک مدت تک بجز ان کے گود کے اور کچھ دیکھنے نہیں پاتے۔ ہوا تو ان کے لیے زہر
 سے بڑھ کر ہے۔ اسی خانہ نشینی کا نتیجہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں ان کے قواس
 جسمانی مضحک ہو جاتے ہیں۔ اور قبل از وقت موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
 جب بچہ چھ مہینے کا ہوتا تو ایک دوسری رسم ادا کی جاتی جس کو دوران
 میں بچہ کو نہایت صاف اور ہلکی غذاؤں دی جاتی ہیں۔ اور کبھی کبھی دو چار الفاظ سکھائے
 جاتے۔ والدین اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے کہ کلفت وغیرہ شروع ہی سے
 دور کر دی جائے۔ اور مختلف حرکات کا صحیح طور پر تلفظ کریں۔ ان باتوں کے علاوہ
 افسانہ گوئی بچوں کی تعلیم و تربیت کا ایک خاص جز خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ دوران
 میں ہے کہ والدین کو بچوں کو ایسے قصے سنانا چاہیے جن سے ان میں علم
 پرستی کا ذوق پیدا ہو۔ اور ان کا اخلاق پر اچھا اثر پڑے۔
 غرض اسی طرح آٹھ برس تک بچہ کی تربیت کا سلسلہ جاری رہتا۔
 جبکہ وہ باقاعدہ درس گاہ میں داخل ہوتا۔ وقت معینہ پر بچہ ایک کشادہ اور
 ہوادار کمرہ میں لایا جاتا جس کے وسط میں ایک بلند منبر ہوتا جس پر خوشنوا
 لکڑیاں نہایت باقاعدہ شکل میں رکھی رہتیں۔ منبر کے چاروں طرف گھانسون
 کی بنی ہوئی محرابیں ہیں جس کے ارد گرد پھولوں کے مارے آویزاں رہتے۔
 کمرے کی دیوار میں مختلف قسم کی تصویروں اور عالمانہ اقوال ہے آراستہ رہتیں
 غرض پر نہایت خوشنادر یاں بھی ہوتیں منبر کے ایک طرف ایک شخص بیٹھا ہوا

نظر آتا۔ جس کی صورت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا دماغ علم کا مخزن ہے۔ اس کا دل نہایت شریفانہ اور محبت آمیز جذبات سے لبریز ہے۔ اس کی فطرت نہایت بلند ہے۔ اُسکی روح نہایت روشن اور پاکیزہ ہے۔ اس کے پیچھے اس کے شاگردوں کی قطار بن نظر آتی۔ جب تمام لوگ بیٹھ جاتے۔ تو سب سے پہلے اس خاموشی کے عالم میں منقرون کی آواز بلند ہوتی۔ جس کے ساتھ ساتھ باجون کے بھی راگ بلند ہوتے۔ ان نغموں کے بعد مقدس آگ روشن کیجاتی۔ شاگرد اُستاد کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا۔ اور نہایت ادب کے لہجے میں کتنا یہ خدا کو پہچاننے اور علم روحانی حاصل کرنے کے لیے اسے آقا! میں تیرے پاس آیا ہوں اُستاد نہایت محبت آمیز لہجہ میں مناسب جواب دیتا۔ اور پھر دونوں دعا کرتے۔ کہ اے خدا! تو ہمو کو توفیق دے کہ ہم اپنے وعدوں کو برابر قائم رکھیں۔ اس کے بعد آچار یہ یعنی اُستاد بہ ہمجاری یعنی شاگرد کو نذر گانہ نصیحتیں کرتا۔ اور اس کے فلاح و ترقی کے لیے دعا کرتا۔ اور یہ شاندار رسم ختم ہو جاتی۔

دوسرے دن شاگرد اُستاد کے اُستانہ پر حاضر ہوتا۔ بیان اسکو ایک نیا عالم نظر آتا۔ بلند دیواریں ہوتیں۔ نہ فرش زبرین نہ ظاہری نقش و نگار۔ لیکن ایک مقدس ذات ہے۔ جو دنیاوی جاہ و جلال سے بے نیاز ہے جس کی نگاہیں روحانیت سے لبریز ہیں۔ سب سے پہلے اُستاد شاگرد کو دیکھ کے مقدس ترین دعاؤں کی تعلیم دیتا اور تھوڑی دیر تک اپنا روحانی اثر ڈالنے کے لیے شاگرد کی آنکھوں کی طرف توجہ قلبی کے ساتھ دیکھتا رہتا۔ اس کے بعد والدین بچہ کو شفیق اُستاد کے حوالہ کر کے رخصت ہو جاتے۔ اور اب بچہ اُستاد کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش و تعلیم پاتا۔

بے شبہ جدید تمدن نے آج علوم و فنون کے ہزاروں دروازے کھول دیے ہیں۔ لیکن یہ محبت یہ خلوص یہ ہمدردی یہ اطاعت آج کل کے اُستاد و شاگردین ہم کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے! یہ اسی باہمی محبت و اطاعت کا اثر تھا جو قدیم زمانہ میں شاگرد کو اُستاد کا عکس کامل بنا دیتا تھا۔ اور آج بھلی ہم دیکھتے ہیں کہ ملک میں قدیم طرز تعلیم نے جو دماغ پیدا کیے ہیں جدید تعلیم بہت کم افراد ایسے پیدا کر سکی ہے، علمی دنیا آج ماتم کر رہی ہے کہ اب قدیم زمانہ کے دل و دماغ کے لوگ پیدا نہیں ہوتے۔ کیا موجودہ نصاب تعلیم سے جو ہماری یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔ یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اسطو

منو۔ تو علی سینا۔ غزالی۔ ایسے لوگ پیدا ہوں؟ بے شہمہ ان افراد کا دوبارہ پیدا ہونا بالکل ممکن ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کی پرورش و تربیت اسی طریقہ پر کریں۔ جیسا قدیم ہندوستان میں یا اسلام کے عہد اقبال میں رائج تھا۔ اس سے یہ ہمارا مطلب نہیں کہ ہم حروفِ حرکت قدیم طرزِ تعلیم کے مقلد بن جائیں۔ ممکن ہے کہ بہت سی ایسی باتیں ہوں جو موجودہ رفتارِ زمانہ کے الحاق سے علی صورت اختیار نہ کر سکیں۔ تاہم جو کچھ اس میں اور جدید ضروریات کے مطابق ہے اس کی تقلید سے ہم کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بچوں کی ابتدائی پرورش و تربیت۔ شاگردِ استاد کے باہمی مخلصانہ تعلقات ان چیزوں کی اہمیت سے کون شخص انکار کر سکتا ہے؟

اصول تعلیم

ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ قدیم استاد کے پیش نظر کیا اصول ہوتے تھے اور ان میں وہ کمان تک عملاً کامیاب ہوئے ہم کہ چلے ہیں کہ سب سے بلند گرد استاد سے مخاطب ہو کر یہ کہتا تھا "خدا کو پہچاننے اور علم و وحانی کو حاصل کرنے کے لیے اے آقا! میں تیرے پاس حاضر ہوا ہوں استاد جواب دیتا ہے کہ اے عزیز بچے میں تجکو خدا کے سپرد کرتا ہوں کہ وہ تجکو اپنی روشنی سے فیضیاب کرے۔ اس کے بعد جن علوم کی تعلیم کا استاد وعدہ کرتا ہے ان میں سب سے پہلے پُران و دیان ہے (یعنی علم و وحانی)

غرض ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہے کہ "تزکیہ نفس" استاد کا سب سے بڑا مہم نظر ہے یعنی سب سے پہلے طلبہ کے اخلاق کی تہذیب و تنقیح کی جائے۔ لیکن آج اُس کا نام و نشان بھی دکھائی نہیں دیتا ہے۔

دوسرا اصول جس کو معلم شاگرد کے سامنے ہمیشہ پیش نظر رکھتا وہ تھا اذی روح مخلوق کے ساتھ محبت و ہمدردی رکھنا۔ آجاریہ شاگرد سے کہتا ہے میں تجکو خدا کے سپرد کرتا ہوں کہ تو تمام اذی روح کائنات کو امن دے "اس خیال کو بار بار شاگرد کے سامنے دہراتا اور خود بھی اس پر عمل کرتا رہتا ہے چنانچہ وہ ہمیشہ علمی مہمان نوازی میں مصروف رہتا ہے اور جب کبھی اس پاس کرسنے والوں پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ سب سے پہلے اپنے شاگردوں کے

اُن کی مدد کے لیے اُس مقام پر موجود ہو جاتا ہے۔ اس عملی تعلیم کا جو نتیجہ ہوتا تھا۔ وہ ظاہر ہے۔ طلبہ میں ادائیگی عمر ہی سے ہمدردی اور محبت کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ عالم کائنات کی ہر جاندار سے کو محبت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے تھے اسی بنا پر قدیم ہندو جانوروں کے گوشت سے سخت متنفر تھے۔ اور یہ خیال آج بھی ہندو میں بہت بڑی حد تک قائم ہے۔

اس کے علاوہ طلبہ میں حقوق تمدن اور وطنیت کا بھی احساس پیدا کیا جاتا تھا چنانچہ جب شاگرد استاد کے مگر میں داخل ہوتا تھا تو دعا کرتا تھا کہ اے خدا تو مجھ کو توفیق دے کہ میں اپنے خاندان اور اپنی قوم کے علاوہ دوسروں کی بھی امداد و خدمت کر سکوں ۱۱

حق پرستی ایک دوسرا بہت بڑا اصول ہے جو ہمیشہ استاد و شاگردوں کے پیش نظر رہتا تھا چنانچہ پانچ بار استاد و شاگرد اس مقولہ کو دہراتے ہیں "خدا کرے کہ ہم جو دنی باتوں کو چھوڑ دیں۔ اور حق کو تلاش کریں۔ علاوہ اس کے باپ اپنی و دای تقرب میں بچہ کو حق پرستی کے متعلق نہایت پر جوش الفاظ میں نصیحت کرتا ہے۔ اس تعلیم کا جو نتیجہ تھا اس کا اندازہ گذشتہ تاریخ سے ہو سکتا ہے لوگ نہایت نیک نیتی سے کار و بار کرتے تھے نہ جھوٹے وعدہ کرتے تھے۔ نہ مخلف جرائم کے مرتکب ہوتے تھے۔

علاوہ اس کے طلبہ میں شیفتگی حسن کا بھی مذاق پیدا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آغاز تعلیم کے وقت شاگرد دعا کرتا ہے کہ اے خدا تو مجھ کو اپنے سایہ رحمت میں لے کر اس قابل بنا کہ میں خوبصورت مناظر کی روحانی کیفیت کو محسوس کر سکوں ۱۲ اس میدان میں قدیم ہندو نے جو حیرت انگیز کمالات حاصل کیے۔ ان کا اندازہ ہندوستان کے کھنڈروں میں ضلع گڑھی سنگتراشی وغیرہ کے باقی ماندہ نمونوں سے ہو سکتا ہے۔ موسیقی اور شاعری تو ہندوستان کے خمیر میں تھی۔

استاد کی توجہ آج کی طرح شاگرد کی محض داغی تربیت تک محدود نہ تھی بلکہ طلبہ کی جسمانی تربیت و صلاح بھی استاد کا ایک بہت بڑا فرض تھا۔ چنانچہ استاد طوالت عمر تندرستی اعضا قوت وغیرہ کے بیش بہا فوائد و نتائج ہمیشہ شاگرد کے پیش نظر کرتا رہتا تھا۔ اور ان کو جسمانی ورزشوں کی ترغیب دیتا رہتا تھا۔ یہ اسی

حفظان صحت کا اثر تھا کہ لوگ قدیم زمانہ میں سیکڑوں برس تک جیتے تھے۔ آج کی طرح وہ دھان پان نہیں ہوتے تھے۔

آخر میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُستاد عام تعلیم کے ساتھ ساتھ علمی فنون کی بھی تعلیم دیتا تھا۔ تاکہ وہ دنیا میں بہت آرام سے زندگی بسر کر سکیں اور ان کو کسب معاش کے لیے در بدر کی خاک نہ چھانا پڑے چنانچہ ہندوؤں کے قدیم ترین کتابوں میں جدید تمدن کے اکثر علمی فنون کا تذکرہ موجود ہے۔ جن میں ہندوؤں کو مغذ بہ کمال حاصل تھا۔ مثلاً تجارت، کیمیا پارچہ بافی جراثیمی وغیرہ وغیرہ اس لیے ان کو تعلیم کسب معاش کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک طرف علم کو خالص علمی حیثیت سے پڑھتے تھے اور دوسری طرف معاش کے لیے دیگر فنون کو حاصل کرتے تھے۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ ایک مدت کے بعد ہمارے طلبہ کالجوں سے نکلتے ہیں تو بجائے علم کی خدمت کے معاش کی فکر دانگ ہو جاتی ہے اور در بدر کی ٹھوکرین کھاتے رہتے ہیں۔

یہ تھے اصول قدیم تعلیم کے جن سے آج ہماری یونیورسٹیاں بالکل نا آشنا ہیں کیا اُستاد کا فرض محض اُننا ہی ہے کہ وہ طلبہ کو چند گھنٹے تعلیم دے کر الگ ہو جائے؟ کیا اُن کے اخلاق کی تربیت اس کے فرائض سے خارج ہے؟ کیا قدما کے یہ زترین اصول ہمارے جدید استاذہ کے لیے قابل تقلید نہیں ہیں؟ ہاں تاکہ آج ہمارے دل و دماغ علم و فنون سے بھر دے جاتے ہیں۔ لیکن ایسے علم سے ہم کو کیا فائدہ جبکہ ہم اخلاقی درجہ میں حیوانوں سے بدتر ہیں ہم کو ایسے انسان کی ضرورت نہیں جو علمی منبر پر نہایت مقدس صورت لیکر نمودار ہوتے ہیں۔ لیکن جب بدستان عیش میں بیٹھتے ہیں تو ایسا کھل کھیلتے ہیں کہ شرم و حیا آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے لوگوں کا طلبہ پر کیا اخلاقی اثر پڑ سکتا ہے جو خود محتاج تربیت ہوں! ہم اپنی حقیقی فلاح و ترقی کے لیے ان خاک نشینوں کے پر تو فیض کے محتاج ہیں جو ایک طرف علم و فن کے سراپا مثال ہیں اور دوسری طرف فطرتی اخلاق کے پیکر محبم۔



۱۹۲۷ء کا خاتمہ

اس ۱۹۲۷ء! تو ہمارے کام اور حورے چھوڑ کر خاموشی سے چل دیا تو جب آیا تھا تو ہم کو تجھ سے بہت سی امیدیں تھیں اور ہمیں تیرے ساتھ ایسا خلوص تھا کہ ہم سمجھتے تھے کہ تیرے پیش رو نے جو ظلم و ستم ہم پر کیا ہے وہ تیرے عہد میں تبدیل ہو جی جی ہو جائے گا۔ مگر افسوس تو نے اپنے ۶۵ دن میں کوئی بات بھی ایسی نہ کی کہ ہم تیرا کچھ الفاظ میں کرین مرنے والے کو بُرا کہنا یا اس کی بے یون کا الم شرح کرنا نہ جیسا ہرے۔ لہذا ہم ایسے واقعات سے چشم پوشی کرتے ہیں اور ان کے تذکرے سے اپنے صفیات گندہ نہ کریں گے۔ اہم تیرے عہد کے ان واقعات کا ذکر کرنا جو تو نے رسالہ دگلہ کے ساتھ کیے بہت ضروری ہیں۔ تیرے سارے عہد میں رسالہ دگلہ نے کی اشاعت کا انتظام خراب رہا اور ایک رسالہ بھی وقت پر نہ شائع ہو سکا۔ جنوری و فروری کے رسالے اپریل میں اور مارچ و اپریل کے رسالے مئی میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد خیال تھا کہ مئی کا رسالہ مئی میں شائع ہو جائے گا۔ اور انشاء اللہ آئندہ ہر رسالہ اپنے وقت پر نکلے گا مگر ایسا نہ ہوا بلکہ پورے چار ماہ کے بعد مئی و جون و جولائی کے شمارے رسالے ماہ اکتوبر میں نکلاں پڑے۔ اور پھر شروع دسمبر میں اگست و ستمبر و اکتوبر نکلے۔ ان رسالوں کے شائع ہوجانے سے خیال تھا کہ آخر دسمبر یا شروع جنوری میں بیقہ دور رسالے نکال کر ۱۹۲۷ء کا خیر مقدم کریں گے مگر یہ بھی نہ ہوا اور تیرے عہد کا یہ بقیہ کام تیرے نشین کے دوسرے بیٹے میں انجام پایا۔ اس ۱۹۲۷ء! اگر تیرے عہد میں ہمارا کام وقت پر ہوتا تو ہمیں دگلہ کے خریدار کافی ملتے۔ اور تیرے پیش رو سال نے جو ستم آرائی ہم پر کی تھی

اس کی کچھ تلافی ہو جاتی۔

۱۰۔ ہم اس معاملے میں ہم اس قدر تیرے ضرور شکر گزار ہیں گو جو مضامین تیرے عہد میں دنگار کے صفحوں پر شائع ہوئے وہ عام طور پر پسند کیے گئے اور اکثر ناظرین کو تو یہ دھوکا ہوا کہ یہ مضامین مولانا شرر مرحوم ہی کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں۔ اور یہ ہمارے واسطے حیرت ہے کہ ہمارے اچیز مضامین میں قدر و انون کو وہی لطف آیا جس کا چسکا مرحوم نے پیدا کر دیا تھا اور جس کے مزے سے لطف اٹھانے کے واسطے ناظرین دنگار ہمیشہ کے واسطے مایوس ہو چکے تھے۔

یہ تو تیرا وہ کارنامہ تھا جو تو نے ہمارے ساتھ کیا اب چند اپنے وہ کارنامے بھی سن لے جو تو نے ہمارے ملک یا ہمارے شہر کے ساتھ کیے ملک کے ساتھ جو تو نے سب سے بُرا سلوک کیا وہ یہ ہے کہ تیرے عہد میں استیجی تری کمیشن کے نام سے ایک کمیشن منعقد کیے جانے کی تجویز ولایت میں پاس ہوئی۔ اور اس کمیشن کے پریسڈنٹ سائمن صاحب منتخب کیے گئے۔ اور چونکہ اس کمیشن میں کسی ہندوستانی ممبر کا انتخاب نہیں کیا گیا اور کوشش کی گئی کہ یہ کمیشن ہندوستانی عنصر سے بالکل پاک و صاف رہے لہذا ہندوستان کی اکثر غیور قوموں نے اسے اپنی ٹھلی ہوئی توہین و تذلیل سمجھی اور سارے ملک میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔

ہمارے ہمدردان وطن نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے اور سارا ہندوستان اس کمیشن سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ انھوں نے اپنی یہ کوشش پوری کرنے کے واسطے مسلمان لیڈروں کو اپنی طرف کھینچا۔ اور ہندوستان میں بالوی کے سے زبردست متعصب لیڈر نے بجائے نفاق کے اتفاق کا ترانہ گا نا شروع کیا۔ ہمارے پرانے رہبروں کو اپنے افسوس سے تسخیر کیا اور انھوں نے ان کو ساتھ ہنوا ہونے کے شہروں شہروں بائیکاٹ کا نغمہ الاپا۔ مگر عام مسلمان ان کے فقر و غن میں نہ آئے تیرے اس کارنامہ کا جو ناپاک اثر ہو گا۔ اس کا حال تو تیرے جانشین کے عہد میں کھلے گا۔ مگر تیرے ہی عہد میں جو ظاہر ہوا وہ کم نہیں ہے یعنی مسلمانوں کے دو حصے ہو گئے ایک حصہ تو شد و مد کے ساتھ کمیشن کے بائیکاٹ پر تیار ہوا ہے اور دوسرا حصہ اس کے خلاف کمیشن کا خبر مقدم کرنے میں چوٹی سے اڑی تک کارندہ در لگا رہا ہے۔ اسی جوش نے مسلم لیگ کے جو مسلمان

کی مشترکہ آواز تھی، دو ٹکڑے کر دے اور اس کا ایک اجلاس ملک کے مشرقی سرے کلکتہ میں اور دوسرا اجلاس ملک کے مغربی سرے لاہور میں منعقد ہوا اور ان دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف نذر دلش پاس کر کے اپنی عظمت و قوت فنا کر دی۔

اس معاملے میں ہندوؤں کو بھی تو نے کوراہنیں چھوڑا تو نے ان کی قومیت کو بھی جس کا وہ زور شور سے نعرہ لگایا کرتے تھے اور اپنی زیادتی تعداد پر نازان تھے اچھوتوں کو ان سے علیحدہ کر کے مٹا دیا۔ اور وہ اپنی حقوق علیحدہ لینے کے واسطے کمیشن سے ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہیں۔

ان اہم واقعات کو ہذا کیلنسی لارڈ اور ولہاؤں ولسیراے کشور ہند نے پہلے ہی سے سمجھ کر ہندوستان کے نامی نامی لیڈروں کو طلب کر کے مخاطبت کی ایک کمیٹی قائم کی مگر تو نے ان کی بھی نہ چلنے دی اور وہ کمیٹی بجاے اس کے کہ کسی اچھے نتیجے پر پہنچے ایک دوسرے سے نفرت کا سبق لے کر برخاست ہوئی۔

تیسرے عہد کا یہ ناپاک واقعہ تو کسی ہندوستانی کے دل سے محو نہ ہوگا کہ تیسرے پر آشوب زمانے میں امریکائی ایک ناپاک عورت سیر کے بہانے سے ہندوستان میں آئی اور یہاں سے ایک ایسی زہریلی کتاب کا مواد فراہم کرے گئی جس نے ہندوستانیوں کے مابین ہمیشہ کے واسطے کلنگ کا ٹیکہ لگا دیا۔ اس کتاب کا نام اس نے اور انڈیا رکھا اور اس میں اس نے کچھ ایسے بیہودہ خیالات ہندوستانیوں کی طرف منسوب کیے تھے کہ اس کی شہرت نے چند ہی دنوں میں اس کے کئی ایڈیشن چھپوا دیے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب انھیں چند دنوں میں دس لاکھ سے زیادہ شائع ہو چکی ہے۔ ہندوستانی بھائی ان لغو اور بیہودہ خیالات کو اپنی طرف منسوب دیکھ کر گھبرائے۔ اور اس کے جواب میں تادراٹ یا نام ایک کتاب اور دوسری اور اور کتابیں بھی لکھیں۔ مگر ہندوستان کی عزت میں جو اہل اس کتاب نے ساری دنیا کے سامنے لگا دیا وہ کسی طرح نہیں مٹ سکتا۔

ہندوستان میں بھی اس کتاب کے بیسیوں ترجمے ہوئے مگر مکمل ترجمے بہت کم ہیں اگر ناظرین دگلڈز پند کریں اور جن میں اس کتاب کا صحیح ترجمہ دیکھنے کا شوق ہو تو ہم اپنے شہر کے نامور ادیب جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے۔ کو اس کا ترجمہ

کی تکلیف دین اور اس کے اجزاء ماہ باہ دنگلاز میں شائع کر دیا کریں۔ یہ ترجمہ دنگلاز کے ذریعہ سے گو دیر میں شائع ہو گا۔ انشا اللہ بہت ہی صحیح اور بہت ہی دلچسپ ہو گا۔

۱۷۱۷ء: تیری ہم کیا کیا شکایتیں کریں تو نے اپنے آخری عہد میں چلتے چلاتے ہمارے محبوب ترین لیڈر مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجل خاں صاحب دہلوی کا اجانبک چراغ زندگی نکل کر دیا۔ جس سے ہماری رہی سہی قوتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کی موت کسی ایک خاندان کا ماتم نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کے طول و عرض میں صفت اتم کبھی ہے اور جو ہے اسے مسیح الملک کا رونا رورہا ہے۔ اور اب ہندوستان میں ان کی سی ہستی کا پیدا ہونا محال معلوم ہوتا ہے۔ تیرے ہی عہد میں ہمارے شہر کے نامی گرامی حکیم اور ہندوستان کے سرانیہ ناز طیب جناب حکیم عبدالحفیظ صاحب قبلہ فالج میں مبتلا ہوئے اور اٹھنے بیٹھنے سے محروم ہو کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ رہے۔ اس وقت ساری خلقت ان کی مسیحائی سے محروم ہو کے دست دعا اٹھا رہے تھے کہ یا الہی تیرا جانشین مقرر ہو اس ذات ستودہ صفات کے واسطے بابرکت ثابت ہو اور ساری خلقت ان کے فیض سے دوبارہ بہرہ یاب ہو۔

تو نے خاص ہمارے شہر کے واسطے بھی اچھا سلوک نہ کیا۔ تیرے عہد اولین میں ہماری مینو سلیٹی کے ہندو مسلمان ممبر بہت ہی کجی سے اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ مگر تجھے یہ پسند نہ آیا اور ان میں بھی خواہ مخواہ میلاد شریف کا رزولوشن پیش کر کے آگ لگا دی۔ مسلمان ممبروں سے استغفہ دلوا۔ شہر کے مسلمانوں سے جلسے کر کے حکام وقت سے خوشامد کرائی مگر ان کی ایک جائز خواہش جو ساٹھ سال سے بلا کسی جھگڑے کے پوری ہوتی چلی آتی تھی کسی طرح نہ پوری ہونے دی۔

تیرے عہد کا یہ آخری کارنامہ بے شک یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر مٹی شاہ آغا اللہ خان صاحب سیاحت یورپ کے ضمن میں جن دنوں آکر اچھڑے ہوئے بمبئی لشکر لائے اور جامع مسجد بمبئی میں نماز جمعہ پڑھا کے امامت اور خطابت کا حق ادا کیا اور یہ فرض ادا کر کے ہندوستان کے ان دور دراز کے لوگوں کو جو ایک مدت سے اس بات کے متمنی تھے کہ کسی با اختیار والی ملک کے بیچھے نماز پڑھیں مستفید کرایا۔ اور ہندوستان کو اسلامی مساوات کا بھولا ہوا سبق کہ خدا کی درگاہ میں شاہ دنگلا کا ایک ترجمہ

یاد دلا دیا مگر اس معاملے میں بھی تو اپنی فطرتی ضرورت سے باز نہ آیا اور ہمارے دوسرے
ہزار کسینسی لارڈ آرون صاحب با نقاہم کو بیار ڈال کے شاہ افغانستان کے استقبال سے محروم کیا
اسے ۱۹۲۷ء جا۔ اب ہم تیری زیادہ شکایتیں کر کے دگلڈاز کے صفحات کو گندہ کرنا نہیں چاہتے اور
تیرے بقیہ ناپاک کارناموں پر خاک ڈال کر تجھ سے رخصت ہوتے ہیں۔

قدیم ہندوستان میں تعلیم طریقہ تعلیم

اس عنوان کے تحت میں ہم اُن تمام مختلف قوتوں کا تذکرہ کریں گے جن سے
طلبہ کو انسان بنانے میں کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً استاد کتاب مدرسہ طلبہ کے دنیوی تعلق
وغیرہ وغیرہ۔ یہ مسئلہ ہے کہ اُستاد کی ذات تعلیم کا عنصرِ اعظم ہے دنیا میں کوئی شخصیت
اس سے بڑھ کر طلبہ کے اخلاق پر اثر نہیں ڈال سکتی۔ اس لیے ضرور ہے کہ استاد کے
انتخاب و تقرر میں نہایت احتیاط سے کام لیا جائے۔ طلبہ کی آئندہ زندگی کا فیصلہ اسی
کے ہاتھ میں ہے خواہ وہ اُس کو بگاڑے یا بنائے ہی وجہ ہے کہ قدما کا معیار اس
بارے میں بلند ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم ان صفات کا اوپر تذکرہ کر چکے ہیں جو استاد کے لیے
نہایت ضروری خیال کیجاتی تھیں۔ کیا یہ قدیم معیار ہمارے جدید استادانہ کے لیے شمع
راہ نہیں بن سکتا؟ قدیم ہندوستان میں اُستاد یا تو برہمن ہوتے تھے جو علم و فضل کے
محافظ سے خاص درجہ رکھتے تھے۔ یا وہ تارکین دنیا جو ادھر عمر میں صحرائین ہو جاتے
تھے۔ یہ صحرائین اس امر سے خوب واقف ہوتے تھے کہ بچوں کی پرورش اور اُن
کے قواسم کاغیہ کی تربیت کس طرح کرنی چاہیے۔ ان تجربہ کار بزرگوں کی معیت
سے طلبہ کے اخلاق پر نہایت قوی اثر پڑتا تھا۔

قدیم کتابوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں دو
قسم کے تعلیم انیسٹوٹن قائم تھے ایک تو وہ جن میں مختلف علوم کے اکیس باہرین فن درس
دیتے تھے جن کے اخراجات خود حکومت ادا کرتی تھی۔ ان درسگاہوں میں منہتی طلبہ تعلیم
پاتے تھے دوسرے وہ جن میں معمولی طلبہ پڑھتے تھے اور نسبتاً ان کی تعداد بہت زیادہ

ہوتی تھی۔

چونکہ استاد و عمو با صحرائین ہوتے تھے۔ اس لیے مدرسے زیادہ تر جنگلون کے پاس واقع ہوتے تھے آرام کے لیے کسی دریا چشمہ تالاب یا نہر کی قربت کار کھا جاتا تھا۔ غرض ایسے مقام پر جہاں ہر قسم کے و فریب قدرتی مناظر ہر وقت پیش نظر ہوں۔ ملک کے نوجوان طلبہ تعلیم پاتے تھے کیا چارلس جدید ماہرین تعلیم اس سلسلہ پر غور کر سکتے ہیں کہ ایسے پر فضا مقام پر تعلیم پانے سے طلبہ کے دل و دماغ پر کس قدر قدرتی اور روحانی اثر پڑ سکتا ہے۔

اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ چونکہ طلبہ شہر سے الگ جنگلون میں بسر کرتے تھے۔ اس لیے وہ انسانی حسن و شعور سے بے بہرہ ہوتے۔ اور سوسائٹی کے نظام اخلاق سے نا آشنا ہوتے تھے۔ بے شہرہ رہبانیت انسانی ترقی کے لیے سم قاتل ہے۔ لیکن قدیم استاد عام تعلیم کے ساتھ اس بات کی بھی تعلیم دیتے تھے کہ طلبہ کو دنیا میں کس طرح رہنا چاہیے؟ ان کو آپس میں کس طرح برائی کرنا چاہیے؟ ان کے باہمی حقوق و فرائض کیا ہیں؟ اس لیے اگرچہ طلبہ دنیا سے الگ رہتے تھے۔ تاہم دنیا کے اخلاق و معاشرت سے بالکل ناواقف نہ تھے وہ اکثر شہر میں مختلف اغراض سے آتے جاتے رہتے تھے۔ اور جب کسی گاؤں پر مصیبت آتی تو یہی صحرائین سب سے پہلے غریبوں کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے۔ ان حالات کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ باوجود گوشہ نشینی کے ان میں حقوق تمدن کا احساس موجود تھا۔ صبر و تحمل حلم و عفو محبت و ہمدردی خلوص و ایشیا انسانی کیرکڑ کے عناصر اصلی ہیں جس کمال کے ساتھ یہ صفات روحانی ان بادشاہ نشینوں میں موجود تھیں کیا اس کا دوسرا حصہ بھی کسی جدید تعلیم یافتہ میں جو ظاہری آرائش و زینت کے لحاظ سے ہر رنگارنگ سے کم نہیں پایا جاتا ہے؟ غرض قدیم ہندوستان میں رشیوں نے حیات انسانی کا جو موقع تیار کیا تھا۔ اس میں دین و دنیا دونوں کی جھلک نمایاں تھی۔

طلبہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ پیدل چلتے تھے۔ نہایت سادہ لباس پہنتے تھے سخت بھون پر سوتے تھے۔ سادہ غذا میں استعمال کرتے تھے۔ شراب گوشت چمٹھی مریج وغیرہ سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں قطعاً

شریک بنین ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ان سے اور بہت سے چھوٹے چھوٹے کام لے جاتے تھے۔ جن کے نام سے بھی شاید آجکل کے طالب علموں کو حار آئے گا۔ مثلاً جھارو دینا۔ برتن صاف کرنا۔ پانی نکالنا۔ لکڑی کا ٹٹا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہی چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے آگے چل کر اعلیٰ علم و اخلاق پر آفتاب بن کر چمکتے تھے اگرچہ یہ سادگی کسی قدر حد اعتدال سے متجاوز تھی تاہم جو اصول پیش نظر تھا یعنی طلبہ شروع ہی سے محنت و جانفشانی کے خوگر ہو جائیں۔ اس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے! ہم کو ایسے از و نعم سے کیا فائدہ۔ جبکہ ہم تھوڑے ہی دنوں میں خدا کی اس اعلیٰ ترین نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ جس پر تمام انسانی ترقیوں کا دار و مدار ہے۔ یعنی صحت جسمانی۔

اس سلسلہ میں طریقہ تعلیم کے متعلق ابھی کچھ کتنا فری سے بعض لوگوں کا خیال؟ کہ قدیم ہندوستان کی تعلیم بالکل ابتدائی ہوتی تھی یعنی درس میں بہت کم کتابیں رہتی تھیں لیکن یہ بالکل واقعہ کے خلاف ہے قدیم استاد کے سامنے ہرن کی سیکڑوں کتابیں ہوتی تھیں لیکن وہ اس کتابی علم کو بہت زیادہ قیمت نہیں دیتے تھے ضروری مواقع پر کتابوں سے کام لیتے تھے ورنہ وہ ہمیشہ طلبہ کی تعلیم میں دو چیزوں کو خاص طور پر کام میں لاتے تھے ایک تو اپنا زبردست حافظہ جس سے وہ خود اپنی رہنمائی اور طلبہ کو ان کے اسلاف کے خیالات سواکشا کر دینے کے لیے کام لیتے تھے۔ اور دوسرے گرد و پیش کے حالات و واقعات جن سے وہ طلبہ کی قوت مشاہدہ کی تربیت میں کام لیتے تھے۔ حقیقت میں یہی قوت مشاہدہ علم کا حقیقی منبع ہے جس سے ہمارا جدید تعلیم یافتہ گروہ بالکل بے بہرہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر باوجود اس قدر درس و تعلیم کے محض سطحی اور عامیانہ ہوتی ہے اور حقائق اشیاء تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس بنا پر قدیم استادوں کی خاص کوشش ہوتی تھی کہ طلبہ بہ نسبت کتاب کے زیادہ تر صحیفہ قدرت کا مطالعہ کریں تاکہ ان میں ذاتی غم و خوض کا وہ پیدا ہو۔ اور ہر قدم پر کتاب کی رہنمائی کے محتاج نہ رہیں۔ چنانچہ وہ اکثر میدانوں اور جنگلوں میں تنہا چھوڑ دیے جاتے تھے جہاں وہ عالم قدرت کی ہر چیز کو توجہ کے ساتھ دیکھتے تھے اور ان پر ایسے اسرار منکشف ہوتے تھے جو کتابی علم کے دائرے سے بالکل خارج ہیں۔

علاوہ اس کے استاد ان کو اکثر جسمانی و زہنی نشون کی بھی تعلیم دیتا تھا۔ تاکہ ان کی صحت میں خلل نہ آنے پائے۔ غرض ایسے استاد کے سامنے شفقت میں طلبہ کم از کم جو میسویں

اور زیادہ سے زیادہ اڑتالیسویں سال تک تعلیم و تربیت پاتے تھے تعلیم ختم ہونے کے بعد شاگرد اُستاد کی خدمت سے رخصت ہوتا ہے۔ اور نہایت ساز و سامان کے ساتھ گھر واپس لایا جاتا ہے۔ جان اس کے والدین مدت کے بجھڑے ہوئے عزیز بیٹے کے شوق میں بیتاب رہتے ہیں۔ رخصت ہونے وقت اُستاد شاگرد کو ان پر شوکت الفاظ میں مخاطب کرتا ہے۔

”بیچ بول پاکیزہ زندگی بسر کر شاستر کے مطالعہ سے غافل نہ رہ۔ سلسلہ اولاد کو ترک نہ کر۔ قوم کی تربیت سے غافل نہ رہ۔ بجز نیکی اور کوئی راستہ اختیار نہ کر۔ نام و نمود کے لیے فضول کوشش نہ کر ایسے کاموں سے احتراز نہ کر جن سے علما اور تیرے بزرگوں کو ناز و ہو جو اپنے والدین کو عزت کی نگاہ سے دیکھ سحر نہ ہانوں کی خاطر و ضیافت نہ اچھے کاموں کے علاوہ اور کوئی کام نہ کر۔ ہمارے محض ان افعال کی تقلید کر جو حقیقت میں اچھے ہوں۔ اور ان کو چھوڑ دے جو قابلِ اعتراض معلوم ہوں۔ بعض علما اور پاکیزہ نفس کی صحبت میں بیٹھ اور ان پر یقین رکھ۔ خیرات کر۔ اگر تیرے دماغ میں شکوک پیدا ہوں تو ان لوگوں کا طرز عمل اختیار کر جو انصاف پرست اور پاکیزہ اخلاق ہیں۔ یہ میرا حکم ہے۔ یہ میری نصیحت ہے۔ یہی دیکر کی تعلیم کا حقیقی مدار ہے۔“

یہی قدیم ہندوستان کا کانو کیشن ایڈرس تھا۔
قدیم تعلیم کے تمام اصول اب آپ کے پیش نظر ہیں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ دین اصول انسانی زندگی کے لیے کتنا تک ضروری اور کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیا ہمارے جدید اساتذہ کا فرض محض اس قدر ہے کہ وہ طلبہ کے دماغ کو علوم و فنون سے بھر دیں؟ تربیت اخلاق۔ حفظانِ صحت کے اہم فرائض کس سپرد کیے جائیں؟“

سُطَّانُ مُعزِّ الدِّینِ کُتُبِ الدِّینِ بَہرِ الدِّینِ بَغْرِ الدِّینِ

تین کی وفات کے بعد وزیر اور امرا نے بجائے کچھ کے کیتقا کو تخت پر بٹھایا اور بقول ابن بطوطہ وزیر سلطنت نظام الدین کچھ کا دشمن تھا۔ اس نے ایک کجلی محضر جس میں کرامت سلطنت کے دستخط تھے کچھ کو دکھا کے کہا سب لوگ کیتقا کی بیعت کرنے کو آمادہ ہیں کچھ نے چارہ کالو چھاتو کہا آپ سندھ میں بھاگ جاسیے اس نے کہا کہ سب بھاگ جائیں اور تمام املا میرے دشمن ہیں بھاگ کر کیسے جان بچا سکتا ہوں؟ نظام الدین نے جواب دیا آپ تشریف لے جلیں بھاگ کی کجیاں میرے پاس ہیں۔ میں اسی وقت آپ کو یہ حفاظت تمام شہر کے باہر کر دوں گا۔ کچھ نے شکر ادا کیا اور فوراً ایک تیز دم گھوڑے پر سوار ہو کر سندھ کا راستہ لیا۔ اس کے بعد نظام الدین معز الدین کے پاس آیا۔ کچھ کو اس طرح فریب دیکر دہلی سے نکال دینے کا حال بیان کیا۔ اور امرا کو بھی اس کی خبر کی۔ سب نے متفق ہو کر کیتقا کی بیعت کی کیتقا کا جو کہ عقول شباب تھا تخت پر بیٹھے ہی عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا جتنا کہ کنارے ایک عالی شان کوشک اور رجنٹ کا سا خوش فضا باغ طیار کر کے اس کو خوبزیر و نازک اندام پر بٹھالوں کا مسکن بنایا اور نظام الدین کو وزیر مقرر کر کے کل اعتبارات اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ بادشاہ کو غافل دیکھ کر نظام الدین کے دل میں تاراج و تخت کی ہوس ہوئی۔ لہذا تمام مقرران سلطنت اور امرا سے کہا کہ جو اس کی راہ میں حائل تھے معمولی الزام دے دیکر خود بادشاہ کے ہاتھ سے قتل کرادیا۔ اسی اثنا میں مغلوں نے لاہور کے مضافات پر حملہ کیا اور شکست پائی۔ کیتقا کی ہراہی میں ایک مغلوں کی فوج نوکر تھی وہ نظام الدین کے خلاف تھی۔ لہذا اس موقع پر نظام الدین نے یہ ظاہر کر کے کہ یہ لوگ دشمن مغلوں سے ملے ہوئے ہیں اور باہم خط و کتابت رکھتے ہیں سب کو تہ تیغ کرادیا۔ ان معاملات کی خبریں بغیر خان کو پہنچیں تو اس نے کیتقا کو بہت سے نصیحت آمیز خطوط بھیجے۔ اور جب ان کا کوئی نتیجہ نہ ہوا تو خود فوج لے کر دہلی کی طرف چلا۔ شاہی فوج بھی مقابلہ کو طیار ہوئی۔ اور دریائے گنگا کے کنارے پہنچ کر بغیر خان کے سامنے صف آرا ہو گئی۔ بغیر خان نے تین روز تک برابر مصالحت آمیز خطوط لکھے اور ان میں بیٹے سے ملنے کا بھی ارادہ ظاہر

کیا مگر نظام الدین نے کوئی بات منظور نہ ہونے دی آخر جو تھے روز عاجزا اگر بغرا خان نے
 کیتقاد کو اپنے قلم سے اس مضمون کا خط لکھا کہ "اے فرزند مجھے تیرے دیکھنے کا چید اشتیاق
 ہے۔ اور اب زیادہ صبر کی تاب نہیں ہے اپنی صورت حضرت یوسف علیہ السلام کے مانند دکھا کر
 میرے بے نور دیدے کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں کی طرح منور کر میں تیرے بھائی شاہی اور
 عیش و عشرت میں رخنہ انداز نہ ہوں گا۔ اور آخر میں یہ شعر لکھا۔

گرچہ فردوس مقامی خوش است ہیج بہ از لذت دیدار نیست

اس خط کا کیتقاد پر بڑا اثر ہوا۔ اور چاہا کہ تنہا باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر
 ملاقات سے شرفیاب ہو مگر نظام الدین مانع ہوا اور اس بات پر آمادہ کیا کہ خود
 بغرا خان شاہی خدم و حشم کا لحاظ رکھ کے بادشاہ کے سامنے ملاقات کو حاضر
 ہو۔ بغرا خان نے کمال دور اندیشی سے اس بات کو مان لیا۔ اور دریا پار ہو کر
 بیٹے کے سامنے دست بستہ حاضر ہوا۔ تین مہینہ حسب دستور زمین لوس ہوا۔ مگر اپنی
 ذلیل حالت اور کیتقاد کے تکبر کو دیکھ کے جس پر باپ کی اس حالت کا کچھ اثر ہوا
 تھا بغرا خان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ یہ دیکھ کر کیتقاد سے
 بھی ضبط نہ ہو سکا تخت سے نیچے اتر کے دوڑا اور باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ باپ
 نے اٹھا کر گلے لگایا۔ اور دونوں ملکر بہت دیر تک روتے رہے۔ اور تمام رات
 دربار نے بھی اس روتے میں ساتھ دیا۔ اب کیتقاد نے باپ کو تخت پر بٹھایا۔
 اور سامنے ادب و تعظیم کے ساتھ کھڑا ہوا۔ اور بہت سی دولت باپ پر سے
 بچھا کر کی۔ یہ صحبت عیش و نشاط چند روز تک گرم رہی جس کا مفصل حال حضرت
 امیر خسرو نے مثنوی قران السعدین میں نظم کیا ہے۔ اب بغرا خان نے رخصت
 ہونے کا ارادہ کیا۔ اور چلتے وقت بیٹے کو بہت سی نصیحتیں کیں اور آخر میں گلے
 سے لگا کر کان میں کہنا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو نظام الدین کی فکر کر دو۔ ورنہ
 ایک لمحہ کا بھی اسے موقع مل گیا تو تیرا قلع و قمع کر دے گا۔ یہ کہہ کے روتا ہوا
 رخصت ہوا اور اس روز نہ کھانا کھایا اور نہ پانی پیا۔ اور اپنے خیمے میں
 بیوی بچہ کر کہا کہ آج کے دن میں نے اپنے تخت جگر کیتقاد اور مملکت دہلی کو
 آخری بار رخصت کیا ہے۔ کیتقاد باپ سے رخصت ہو کر ادھر کا دورہ کر رہا ہوا

دہلی واپس آیا اور چند روز باب کی نصیحتوں پر عمل کرنے یا تھا کہ ایک پرینا دے
عشق میں دیوانہ ہو گیا اور اُس کے سامنے یہ شعر پڑھا ہے

شب ز محی تو بہ کتم از بیم ناز شاہدان بامداد آن رسد ساقی باز در کاہ آورد

اُس نے حبیبین نے بادشاہ کے منہ سے یہ شعر سنتے ہی جواب میں یہ شعر پڑھا ہے

غمزہ نہ اندھ فرہم عابد صد سالہ را موی پیشانی گرفتہ سوے خار آورد

اور جام کو شراب سے بھر کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے بھجوا دے۔ گریا

سے پلائے تو پھر کیوں نہ بیچے "جام اتھو میں لے کر بے تکلف پی لیا۔ اور اس

گھڑی سے پھر وہی رنگ رلیوں کا نقشہ جم گیا۔ اور تھوڑے دنوں بعد شراب

اور عیاشی کی کثرت سے بہت ہی نحیف و لاغر ہو گیا۔ اس وقت اپنی کمزوری

دیکھ کر اُسے باب کی نصیحت یاد آئی تو نظام الدین کو زہر دلو اسکے اس کا کام

تمام کر دیا اور اُس کی خدمت پر ملک جلال الدین فردوز کو جو ستا سا کا نائب تھا۔

شالکتہ خان کا خطاب دیکر ممتاز کیا۔ مگر صحت میں گھٹن لگ گیا تھا۔ کمزوری

بڑھتی گئی بہانے کہ نقوہ و فالج میں مبتلا ہو کر صاحب بنسراش ہو گیا

بادشاہ نے نئی ناکارگی سے ملک میں بد نظمی ہوئی تو امرانے جاہا کہ خود ہی

بادشاہ بنکر حکمرانی کریں۔ تم کون کے ایک گروہ نے یہ حال دیکھا تو کیقباد

کے سپہ سالار سپر کیو مرث کو حرم سے نکال کر شمس الدین کا خطاب دیا اور تخت پر

بٹھایا۔ جلال الدین فردوز نے اس سے اختلاف کر کے اکثر امرا اور تمام خلیجوں

کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ اور نہ کون کی قوت توڑ دی۔ اہل شہر نے شمس الدین

کی حمایت کرنا چاہی تو فخر الدین کو تو ال نے سمجھا بجھا کے انہیں بھی خٹان سے روک

دیا۔ اب جلال الدین نے شہر میں داخل ہو کر اُن ترک بچوں کو جن کے باپوں

کو کیقباد نے مار ڈالا تھا قید سے آزاد کر کے قصر کلوکری میں بھیجی کیقباد یہاں

کملوں میں پلٹا پڑا تھا۔ ان لوگوں نے لائین اور گھونے مار مار کے اسے شہید

کیا اور لاش دریائے جہنا میں پھینک دی۔ یہ واقعہ آخر ۶۸۵ھ کا ہے۔ مگر بعض

مورخین ۶۸۹ھ بتاتے ہیں۔ یہ بادشاہ دو سال اور چند ماہ تخت نشین رہا۔

اس کی یادگار قلعہ کیلوکری یا قصر خضری تھا جس کی شان میں اہم خسرو

نے غنوی قرآن العبدین میں لکھا ہے۔

قصر گویم کہ بشتے فراخ
روقتہ طوبے در ادراہ شاخ
مگزمانے کے دستبرد سے اب اس قصر کا کہیں نشان نہیں ہے۔ اس بادشاہ کے
سکے میں ایک طرف «السلطان الاعظم معز الدین ابوالخضر کبچاد» اور دوسری
جانب الامام المستعصم امیر المومنین ہذا البقصة حضرتہ دہلی، لکھا ہوا تھا۔

قطعات تہنیت

جشن سالگرہ مبارک سلطان العلوم علی حضرت خسرو دکن

از
نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل ظلہ

گرہ کے جشن نے پھر زنگ بوستان بدلا
گلوں نے جامہ عنادل نے آشیان بدلا
نصیب شاہ میں ایسی حیات ہے جس سے
خضر نے سلسلہ عمر حبا و دان بدلا

ہر دس سالگرہ کیسی جلوہ ریز ہے آج
نیم صبح طرب کیسی مشک بیز ہے آج
نواے ساز کا کیا ذکر نرم شاہی میں
بیان جو تار نفس ہے وہ نغمہ خیز ہے آج

دن آج وہ ہے جبہ سعادت کو ناز ہے
جشن آج وہ ہے جبہ سرت کو ناز ہے
سراج مصطفیٰ پہ ہے ماہ رجب کو ناز
ماہ رجب پہ شہ کی ولادت کو ناز ہے

عثمان میں پانچ حرف میں جو آشکار ہیں
نقطے ہیں چار جو گہر شاہوار ہیں
اس سے کھلایہ راز کہ حامی حضور کے
روز ازل پختن و چار یار ہیں

افوذا زخام گزرت

انگلستان کی عورتیں

از مولانا شہر رحیم

جگہ ہوتی ہے اور اس روز خلاف معمول آدمی بھی کچھ زیادہ ہو گئے تھے۔ بہر حال ۲۷ آدمی تھے جن میں دس سے زیادہ عورتیں تھیں جو لوگ پہلے سے آچکے تھے بیٹھے تھے جن میں میں بھی تھا اور جو لوگ بعد آئے اندر ٹھسے کھڑے تھے اور کسی طرح یہ مسئلہ طے نہیں ہوتا تھا کہ کمان بیٹھن اتنے میں ایک صاحب کے کھڑے ہو کے ایک باضابطہ طریقہ سے تحریک کی کہ لیڈیاں جنٹلمینوں کی گود میں بیٹھ جائیں۔ لیڈیوں کی طرف سے یہ تحریک شکریتہ کے ساتھ منظور کی گئی۔ اور ایک سو فی سیم صاحب بلا تکلف میری گود میں آ بیٹھیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جب گاڑی چل چکی تو پھر کے کہنے لگیں مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو بہاری معلوم ہوتی ہوں گی۔ اب یہ ایک ایسی چیز ہے کہ آپ کے نزدیک اتنا سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی ہو گی۔ مگر اصل یہ ہے کہ وہ وہاں اپنے لک میں شب در در مردوں سے ملتی جلتی ہیں۔ اور یہ ایک بالکل معمولی بات ہو گئی ہے۔ لہذا ہر کسی سے ملتے وقت نہ اُن کے دل میں بُرائی کا خیال ہوتا ہے۔ اور نہ ہرنے والے مرد میں۔ اور جن لوگوں سے اور قسم کے تعلقات ہوتے ہیں اُن سے اُن کا برتاؤ بھی کچھ اور ہی قسم کا ہوتا ہے۔ ہمارے ہم وطنوں کو ان امور کے اندازہ کرنے میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے۔ اور اسی غلطی کی وجہ سے بعض ہندوستانیوں نے بدگمانی کا دائرہ پان تک وسیع کر دیا کہ محض اس خیال پر کہ عورتیں اخلاق اور خندہ جینسی سے ملتی ہیں ہر عورت کو بدکار سمجھ لیا۔ مگر یہ بدگمانی بالکل بجا اور چونکہ اس سے ایک پاک دہن کی عزت پر حملہ ہے لہذا میں کہتا ہوں کہ بہت بڑا گناہ ہے وہاں کے مذاق اور خیال میں جب تک عورت کی عفت میں فرق نہ آئے اُس کو کسی بات پر الزام نہیں دیا جاسکتا جو جو باتیں ایک شادی کی خواہش کرنے والا یا انگریزوں کی اصطلاح میں کورٹ کرنے والا کر سکتا ہے اُن میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ اور ہندوستان کا مذاق یہ ہے کہ ہاتھ لگانا اور کنارا اگر کوئی عورت جان بوجھ کے نامحرم کو اپنی صورت ہی دکھلا دے تو بھی اُس کی نسبت بے آبروئی کا خیال قائم ہو جاتا ہے۔ اور دونوں جگہ کی معاشرت ایسی بدلی ہوئی ہے کہ دونوں خیالات اپنے اپنے حد پر ٹھیک نہیں مگر یہ بہت بڑی غلطی ہے بلکہ میں کہتا ہوں ظلم ہے کہ وہاں کی عورتوں کی عصمت و عفت کا اندازہ آپ اپنی معاشرت کے اصول سے کریں۔ وہاں کی شریف

اور پاکدامن عورتوں کی نسبت باوجود بہت غور سے دیکھنے اور تجسس کرنے کے مجھے کبھی بدگمانی کا موقع نہیں ملا۔

ہمارے بعض دوست اور ہم وطن جو انگلستان سے آئے وہ عموماً وہاں کی عورتوں پر بدگمانی کرتے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ ان سے بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اور یہ غلط فہمی ہر اس شخص سے ہو جاتی ہے جو لندن کو جا کے محض اوپر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں کی شرکین ایک خاص وجہ سے انتہادر جہ کی ناپاک ہو رہی ہیں جس کا الزام زیادہ تر وہاں کے قانون پر ہے۔ میں نے بعض انگریزوں کو یہ کہتے اور دعویٰ کرتے سنا کہ ہماری قوم میں کوئی بازاری اور فاحشہ عورت نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ شاید اسی غور کے قائم رکھنے کے لیے وہاں قانوناً اس کی مانعت کر دی گئی ہے کہ کوئی مکان بدکاری کے لیے کرایہ پر نہ دیا جاسے جس کا منشا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان اپنی سرزمین کو بدکاری سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ہر ذی ہوش سمجھ سکتا ہے کہ ایسے خلاف فطرت انسانی قوانین سے بدکاری کا سد باب نہیں ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی بازاری عورتیں جو تمام شہروں کی طرح مکان کرایہ پر لے کر علانیہ رہنمیں مخفی طور پر ہر محلہ اور ہر شہر کے ہر حصہ میں شریف عورتوں کی طرح رہنے لگیں۔ اپنی بدکاری کا میدان اُنھوں نے سڑکوں اور باغوں کو قرار دے لیا ہے۔ اسی قسم کی سائڈ سٹریٹس ہزار عورتیں ہر وقت اور علی الخصوص تفریح و تفرج کے اوقات میں لندن کی سڑکوں پر پھیلی رہتی ہیں۔ جو گلی کو چون میں دست فروشوں کی طرح اپنی عصمت بچتی پھرتی ہیں۔ یہ کبھی اتفاقاً کسی کو دست یا ملاقاتی کی حیثیت سے اپنے گردون میں لے جاتی ہیں۔ ورنہ عموماً ان کی بدکاریوں کے ذمگی وہاں کے تمام میوزک ہال جو ایک قسم کے تھئیٹر ہیں تمام ہوٹل اور تمام باغ رہا کرتے ہیں۔ یہ عورتیں کہاں سے آتی ہیں۔ اور کون ہیں۔ اس کا حال آپ کو میرے اوپر کے بیان سے معلوم ہو چکا ہو گا کہ وہی شریف لڑکیاں ہیں جن کو شاہی کالاج دلا کے بعض بد معاشوں نے خراب کیا۔ سو سائٹی نے چھڑا دیا اور شرفانے دست گیری سے بے پروائی کی۔ یہ اپنی اولاد کو اس ذلت سے بچانے کی کوشش کرتی

ہیں اور خوب جانتی ہیں کہ اُن سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں۔ یہ خود اپنے پیشہ کو چھوڑنا چاہتی ہیں مگر پیٹ نہیں چھوڑنے دیتا۔ یہ عورتیں وہاں کی اصطلاح میں اسٹریٹ ڈاکر کہلاتی ہیں۔ یعنی سڑکوں پر پھرنے والی۔ یہ اپنی زندگی سے اس قدر عاجز ہیں کہ اگر وہاں کے قانون کی رو سے گداگری جائز ہو جائے تو بے تکلف پھینک مانتے لگیں اور اس لعنتی کے طوق کو گلے سے اتار کے پھینک دیں۔ بلکہ اب بھی اکثر پولیس میں کی آنکھ بچا کے راگبیرون کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتی ہیں۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ خود کشی کے واقعات بھی انھیں میں زیادہ پیش آتے ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جس کے لیے رینڈ اور اُس کے ہم خیال ناول نویسوں نے بہت کچھ سرسرا اور انھیں کی وکالت میں آج بھی وہاں کے وہ آزاد مشرب لوگ جو نوع انسان کو بلا استثنا و امتیاز ایک ہی اسپچ پر لانا چاہتے ہیں زور دے دے کے غل جھا رہے ہیں کہ ان پر لعنت نہ کرو۔ ان کو دروازہ پیسو نہ دھتکارو۔ بلکہ ان پر ترس کھاؤ۔

الغرض اس طبقہ کی عورتیں وہاں کی سڑکوں اور باغوں میں ہر وقت اس قدر پھیلی رہتی ہیں کہ ہرنے جانے والے کو سب سے پہلے انھیں سے سا بقہ پڑتا ہے۔ وہ خود اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ اور چونکہ وضع و لباس میں ان میں اور شریف زادیوں میں کوئی فرق نہیں۔ لہذا ایک معمولی نظر سے دیکھنے والے کا یہ خیال قائم ہو جاتا ہے کہ ساری عورتیں آوارہ ہیں۔ مگر ہرگز ایسا نہیں ہے۔ اور میرے دل پر نقش ہے کہ وہاں کی شریف زادیوں کی سی ہی پاکدامن و پارسا ہیں جیسی آپ کے یہاں ہوتی ہیں۔ اور جیسا کہ ایک پارسا عورت کو آپ کے خیال میں ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کی بہت سمع خراشی کی اور بہت وقت لیا۔ لیکن خوش اور مطمئن ہوں کہ لندن اور اُس کی عورتوں کی جو اجمالی تصویر میں نے آپ کو دکھائی ہے اس کو آپ جان تک تحقیقات سے کام لین گے زیادہ صحیح اور مطابق اصل پائیں گے اب میں آپ کی توجہ اور زحمت فرمائی کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

ضروری اطلاع

قدردانان دگلاند ابد گلداند کا یہ سال ختم ہو گیا۔ اور سال بھر کے بارہ پرچے آپ کی

خدمت میں پہنچ گئے۔ سالہا سال کے قاعدہ کے موافق شہ ۱۹۲۵ء کا چنڈہ دگلڈاز کوئی نیا
 ناول بھیج کر وصول کرنا چاہیے تھا۔ مگر مولانا شرمرحوم کے اٹھ جانے سے دیناے ادب
 کو جو نقصان پہونچے انہیں سے ایک سیہ بھی ہے کہ جو ناول اس سال بطور ہم بہ تقسیم کرنے
 کے واسطے کھوایا گیا تھا وہ مولانا مرحوم کے ان ناولوں کے دیکھنے پر سہ جو گزشتہ
 سالوں میں دیے جا چکے ہیں کسی طرح اس قابل نہیں ہے کہ خریداران دگلڈاز کچھ مین
 میں پیش کیا جاسکے۔ یہ خرابی دیکھ کر مین نے خود ایک ناول لکھنا شروع کیا ہے مگر دیگر ضرورتوں
 میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس کے جلد طیار ہونے کی امید نہیں اور جب تک وہ طیار
 ہو کہ چھپے گا شہ ۱۹۲۶ء کا نصف سے زائد حصہ گزر جائے گا۔ لہذا شہ ۱۹۲۵ء کا چنڈہ
 دگلڈاز وصول کرنے کے واسطے مسلمان تاجداران ہند حصہ اول و حصہ دوم جو حال
 ہی ہیں دگلڈاز پریس سے شائع ہوئے ہیں۔ اور جس میں خلافت راشدہ سے لے کر سلطان
 تیمور کے حملے تک ہندوستان کے مفصل واقعات نہایت سادہ زبان میں مختصر طور پر
 لکھے گئے ہیں۔ اور تقریباً دو سو صفحوں پر ختم ہوئے ہیں۔ گادی پی گزشتہ سالوں
 کے مطابق مارچ شہ ۱۹۲۵ء میں خریداران دگلڈاز کی خدمت روانہ ہوگا
 یہ دی پی محصول ڈاک و فیس رجسٹری ملا کر ہم کا ہوگا خریداران دگلڈاز نوٹ
 کر لیں۔ اور اس درمیان میں اگر کہیں باہر چانا جائے تو ملازمان کو اس کے وصول
 کرنے کی ہدایت کرنے جائیں تاکہ دی پی واپس نہ ہو۔
 آخر میں یہ بھی گزارش ہے کہ جو صاحب آئندہ سال خریدار نہ رہنا
 چاہیں وہ بذریعہ ایک کارڈ کے یہ پرچہ پہونچتے ہی ہمیں اطلاع دے دیں
 تاکہ ان کی خدمت میں دی پی نہ روانہ کیا جائے

فاکسار محمد صدیق حسن۔ ایڈیٹر دگلڈاز

کرہ بزن بیگ خان۔

لکھنؤ

دگلہ از

مولانا شہر رحوم کی یادگار اردو کا مشہور ادبی و تاریخی رسالہ جس نے زبان اردو کے علمی خزانے کو اعلیٰ ترین سطح پر بخیر برداروں کو ایک سال خریدار رہنے کے بعد اگر وہ دوسرے برس بھی خریدار رہیں تو ایک نیا ناول مفت تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اور وہی سال ابجد کے جذبہ اور حصولِ ظاہر پر ایک روحانی بارہ آئین دی کی روانہ کر دیا جائے گا۔
 نیچر دگلہ از - لکھنؤ

تصانیف مولانا محمد عبدالحلیم صاحب مرحوم

تاریخ سوانح عمری اور پیکر وغیرہ

- (۱) جنید بغدادی حضرت جند کے حالات -
- (۲) ابو بکر شبلی حضرت شبلی کے حالات -
- (۳) حسن بن صباح بانی فرقہ ابلیس کے حالات -
- (۴) خواجہ برغین الدین خواجہ اجیری کے حالات -
- (۵) ملکہ زلوفہ بیہ سلت کی ایک نئی شہزادہ -
- (۶) سکندرت جبریل جناب سکندر بن ابیہ کے حالات -
- (۷) قرة العین ایران کی مشہور مجتہدہ کی حالات -
- (۸) ولادت سرور عالم مولانا شریف حضرت ملا رابع ابن عربی کا ترجمہ شہزادہ شہین اور ظلم کا نظم میں جلد
- (۹) سفر نامہ شافعی الامام روح کے سفر کے حالات -
- (۱۰) سر سیدی دینی بہ اکتین -
- (۱۱) قانون وراثت اسلام مولانا کا ایک پیکر -
- (۱۲) ہندوستان کی موسیقی -
- (۱۳) شمالی آئین حضرت صدیق اکبر کے حالات -
- (۱۴) ذی النورین حضرت عثمان کے حالات -
- (۱۵) ابوالحسن تھنر علی کے حالات -

سازگاری ناول

- (۱۶) عزم مصر عبد بنی طولون کا تاریخی ناول
- (۱۷) فتح اندلس اسپین پر بلوں کا حملہ
- (۱۸) برومہ البری روم پر گاتھ لوگوں کا حملہ
- (۱۹) مشفق فتح ایک نیا تاریخی ناول
- (۲۰) فلپا ارض طرابلس پر صحابہ کا حملہ

- (۲۱) فردوس برین جیسے جی جنت کی سیر -
- (۲۲) قیس لبنی شہو عاشق عرب اور سکی
- (۲۳) معنوقہ بنتی
- (۲۴) لعبت جین عجمی کا تاریخی ناول
- (۲۵) مقدس نازنین ایک نیا ناول
- (۲۶) ماہ ملک غورون کا عروج و افوہات
- (۲۷) یوسف و حیمہ کامل جگہ جی ہنس اپ جی
- (۲۸) امام عرب جاہلیت عرب کی مکمل تصویر و حصہ
- (۲۹) جو مائے حق حضرت رسول اکرم کی سوانح
- (۳۰) عمری بطور ناول حضرت اول عمر دوم چاکر کامل
- (۳۱) زوال بغداد و شیعیہ بنوں کی انقلابی کار
- (۳۲) عربت اک نیا ناول کی تباہی
- (۳۳) شوقین ملکہ دوسری صلیبی لڑائی
- (۳۴) طاہرہ نہایت دلچسپ ناول
- (۳۵) میدنا بازار مولانا کا سب سے اچھا ناول
- (۳۶) نیکی کا پھل نہایت دلچسپ آخری تصنیف
- (۳۷) الفانسیو ایک عاشقانہ ناول
- (۳۸) بابک حرمی سلطان عباسیہ کے حالات
- (۳۹) حسن انجیلنا روس و زم کی لڑائی
- (۴۰) قلوب و افلاک نیا اسپانیہ کے عہد خلافت کے واقعات
- (۴۱) ملک العربیہ و رجبنا چتر شیر اور
- (۴۲) صلاح الدین اعظم
- (۴۳) منصور مومنا سندھ میں ایک انصاری
- (۴۴) خاندان کے حالات

حکیم محمد سراج الحق ایچر دگلہ از کٹرہ بزن بیگان لکھنؤ

تصانیف مولانا عبدالحکیم صاحب مرحوم

دنگد از کی مکمل جلدین

جلد ۱۱۰	جلد ۱۰۹	جلد ۱۰۸	جلد ۱۰۷	جلد ۱۰۶	جلد ۱۰۵
جلد ۱۰۴	جلد ۱۰۳	جلد ۱۰۲	جلد ۱۰۱	جلد ۱۰۰	جلد ۹۹
جلد ۹۸	جلد ۹۷	جلد ۹۶	جلد ۹۵	جلد ۹۴	جلد ۹۳
جلد ۹۲	جلد ۹۱	جلد ۹۰	جلد ۸۹	جلد ۸۸	جلد ۸۷
جلد ۸۶	جلد ۸۵	جلد ۸۴	جلد ۸۳	جلد ۸۲	جلد ۸۱
جلد ۸۰	جلد ۷۹	جلد ۷۸	جلد ۷۷	جلد ۷۶	جلد ۷۵
جلد ۷۴	جلد ۷۳	جلد ۷۲	جلد ۷۱	جلد ۷۰	جلد ۶۹
جلد ۶۸	جلد ۶۷	جلد ۶۶	جلد ۶۵	جلد ۶۴	جلد ۶۳
جلد ۶۲	جلد ۶۱	جلد ۶۰	جلد ۵۹	جلد ۵۸	جلد ۵۷
جلد ۵۶	جلد ۵۵	جلد ۵۴	جلد ۵۳	جلد ۵۲	جلد ۵۱
جلد ۵۰	جلد ۴۹	جلد ۴۸	جلد ۴۷	جلد ۴۶	جلد ۴۵
جلد ۴۴	جلد ۴۳	جلد ۴۲	جلد ۴۱	جلد ۴۰	جلد ۳۹
جلد ۳۸	جلد ۳۷	جلد ۳۶	جلد ۳۵	جلد ۳۴	جلد ۳۳
جلد ۳۲	جلد ۳۱	جلد ۳۰	جلد ۲۹	جلد ۲۸	جلد ۲۷
جلد ۲۶	جلد ۲۵	جلد ۲۴	جلد ۲۳	جلد ۲۲	جلد ۲۱
جلد ۲۰	جلد ۱۹	جلد ۱۸	جلد ۱۷	جلد ۱۶	جلد ۱۵
جلد ۱۴	جلد ۱۳	جلد ۱۲	جلد ۱۱	جلد ۱۰	جلد ۹
جلد ۸	جلد ۷	جلد ۶	جلد ۵	جلد ۴	جلد ۳
جلد ۲	جلد ۱	جلد ۰	جلد ۰	جلد ۰	جلد ۰

دنگد از کی مکمل جلدین

جلد ۱۱۰	جلد ۱۰۹	جلد ۱۰۸	جلد ۱۰۷	جلد ۱۰۶	جلد ۱۰۵
جلد ۱۰۴	جلد ۱۰۳	جلد ۱۰۲	جلد ۱۰۱	جلد ۱۰۰	جلد ۹۹
جلد ۹۸	جلد ۹۷	جلد ۹۶	جلد ۹۵	جلد ۹۴	جلد ۹۳
جلد ۹۲	جلد ۹۱	جلد ۹۰	جلد ۸۹	جلد ۸۸	جلد ۸۷
جلد ۸۶	جلد ۸۵	جلد ۸۴	جلد ۸۳	جلد ۸۲	جلد ۸۱
جلد ۸۰	جلد ۷۹	جلد ۷۸	جلد ۷۷	جلد ۷۶	جلد ۷۵
جلد ۷۴	جلد ۷۳	جلد ۷۲	جلد ۷۱	جلد ۷۰	جلد ۶۹
جلد ۶۸	جلد ۶۷	جلد ۶۶	جلد ۶۵	جلد ۶۴	جلد ۶۳
جلد ۶۲	جلد ۶۱	جلد ۶۰	جلد ۵۹	جلد ۵۸	جلد ۵۷
جلد ۵۶	جلد ۵۵	جلد ۵۴	جلد ۵۳	جلد ۵۲	جلد ۵۱
جلد ۵۰	جلد ۴۹	جلد ۴۸	جلد ۴۷	جلد ۴۶	جلد ۴۵
جلد ۴۴	جلد ۴۳	جلد ۴۲	جلد ۴۱	جلد ۴۰	جلد ۳۹
جلد ۳۸	جلد ۳۷	جلد ۳۶	جلد ۳۵	جلد ۳۴	جلد ۳۳
جلد ۳۲	جلد ۳۱	جلد ۳۰	جلد ۲۹	جلد ۲۸	جلد ۲۷
جلد ۲۶	جلد ۲۵	جلد ۲۴	جلد ۲۳	جلد ۲۲	جلد ۲۱
جلد ۲۰	جلد ۱۹	جلد ۱۸	جلد ۱۷	جلد ۱۶	جلد ۱۵
جلد ۱۴	جلد ۱۳	جلد ۱۲	جلد ۱۱	جلد ۱۰	جلد ۹
جلد ۸	جلد ۷	جلد ۶	جلد ۵	جلد ۴	جلد ۳
جلد ۲	جلد ۱	جلد ۰	جلد ۰	جلد ۰	جلد ۰

منتخب مضامین

متفرق تصانیف

جلد ۱۱۰	جلد ۱۰۹	جلد ۱۰۸	جلد ۱۰۷	جلد ۱۰۶	جلد ۱۰۵
جلد ۱۰۴	جلد ۱۰۳	جلد ۱۰۲	جلد ۱۰۱	جلد ۱۰۰	جلد ۹۹
جلد ۹۸	جلد ۹۷	جلد ۹۶	جلد ۹۵	جلد ۹۴	جلد ۹۳
جلد ۹۲	جلد ۹۱	جلد ۹۰	جلد ۸۹	جلد ۸۸	جلد ۸۷
جلد ۸۶	جلد ۸۵	جلد ۸۴	جلد ۸۳	جلد ۸۲	جلد ۸۱
جلد ۸۰	جلد ۷۹	جلد ۷۸	جلد ۷۷	جلد ۷۶	جلد ۷۵
جلد ۷۴	جلد ۷۳	جلد ۷۲	جلد ۷۱	جلد ۷۰	جلد ۶۹
جلد ۶۸	جلد ۶۷	جلد ۶۶	جلد ۶۵	جلد ۶۴	جلد ۶۳
جلد ۶۲	جلد ۶۱	جلد ۶۰	جلد ۵۹	جلد ۵۸	جلد ۵۷
جلد ۵۶	جلد ۵۵	جلد ۵۴	جلد ۵۳	جلد ۵۲	جلد ۵۱
جلد ۵۰	جلد ۴۹	جلد ۴۸	جلد ۴۷	جلد ۴۶	جلد ۴۵
جلد ۴۴	جلد ۴۳	جلد ۴۲	جلد ۴۱	جلد ۴۰	جلد ۳۹
جلد ۳۸	جلد ۳۷	جلد ۳۶	جلد ۳۵	جلد ۳۴	جلد ۳۳
جلد ۳۲	جلد ۳۱	جلد ۳۰	جلد ۲۹	جلد ۲۸	جلد ۲۷
جلد ۲۶	جلد ۲۵	جلد ۲۴	جلد ۲۳	جلد ۲۲	جلد ۲۱
جلد ۲۰	جلد ۱۹	جلد ۱۸	جلد ۱۷	جلد ۱۶	جلد ۱۵
جلد ۱۴	جلد ۱۳	جلد ۱۲	جلد ۱۱	جلد ۱۰	جلد ۹
جلد ۸	جلد ۷	جلد ۶	جلد ۵	جلد ۴	جلد ۳
جلد ۲	جلد ۱	جلد ۰	جلد ۰	جلد ۰	جلد ۰

مولانا شریک خیالی ناول

تفاصاتی کی شادی ایک دلچسپ قصہ
حسن کا ڈاکو حرام پور کے نواب کا حال
نامہ ہر دو حصہ
اسرار در بار حرام پور - حرام پور کے نواب
کے رہنے سے حالات ہر دو جلد -
غیب دان دو لہن - کتاب غیب دانی -
خوفناک محبت - ہندوستان کی تشریف نرا دون کی
بالہ اسنی و جالت کی اس کرچی تقوید نہیں ہو سکتی
دلچسپ مصنف کا پہلا ناول نظم

ڈرامے اور نظمیں

ایسری بابل گولڈ ہمت کے ایک ڈرامے کا
اردو ترجمہ نظم ہیں -
زمانہ اور اسلام ایک پوسٹر و لڈ نظم
شب عشم فراق کی بتا بیان اور بقران بیان
شب ہل فراق کے بعد ہل کا بیان -

مضامین شریک

شاعرانہ و عاشقانہ - دو حصہ
تاریخی و جزائی - ایضاً
گزشتہ لکھنؤ -
ختم سال و شروع سال -
ادب و تحقیق سال -
اصلاح قوم و ملت -
تاریخی واقعات پر خیال آرائی -
نظم و ڈرامہ

آپ کا خادم حکیم محمد سران الحق شریک گولڈ لکچر ہزن بگیاں بکھنوا

